ہماری دینی و ملّی ذمّہ داریاں

اور

قربِ الٰہی کے دو مراتب

کتاب و سنّت کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

ہماری دینی و ملّی ذمّہ داریاں

اور

قربِ الٰہی کے دو مراتب

کتاب و سنّت کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدّام القرآن، لاہور

۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور-۱۴

اس کتاب کی اشاعت وطباعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے

نام کتاب ——— قربِ الٰہی کے دو مراتب

طبع اوّل تا طبع سوم (جون 1988ء تا جنوری 2004ء) ——— 7700

طبع چہارم (اگست 2005ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر واشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون:03-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 40 روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہِ الَّذِیۡنَ اصطفیٰ

قرآن مجید، فرقان حمید اللہ تعالےٰ کی طرف سے تا قیامِ قیامت نازل کردہ پوری نوعِ انسانی کے لئے کتابِ ہدایت ہے۔ خود باری تعالےٰ نے اس کتابِ عزیز کے متعدد اوصاف مختلف اسالیب سے بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا ایک وصف تصریفِ آیات ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہ مضمون بایں الفاظِ مبارکہ بیان فرمایا گیا ہے کہ: وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا" (آیت: ۴۱) اور یہی مضمون سورۂ کہف میں ان الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا کہ "وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ؕ (آیت: ۵۴) گویا کہ "اک پھول کا رنگ ہو تو سو رنگ سے باندھوں" اور "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے مصداق اللہ تعالےٰ نے اپنی کتابِ مبین میں صراطِ مستقیم کو مختلف اسالیب سے واضح و مبرہن فرما دیا اور اس طرح پوری نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت فرمادی کہ اس میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ پھر اسی اتمامِ حجت کو مؤکد کرنے کے لئے اپنی خاص رحمت کے طفیل انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے جن میں خاتم النبیین سید المرسلین ہیں جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات بھی شامل ہے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں جملہ رسولوں کی بعثت کی غایت بیان فرمائی: رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ (النساء: ۱۶۵) اور نبی آخر الزماں، سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّجِئۡنَا بِکَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ۝

(النساء: ۴۱)۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولی و عملی شہادت، اپنے ارشادات و فرمودات اپنی سنت اور اسوۂ حسنہ سے قرآن حکیم کی ہدایات کی تبیین فرمادی اور عدل و قسط پر مبنی ایک کامل نظامِ حیات بھی قائم کر کے نوعِ انسانی پر آخری درجہ میں کامل اتمامِ حجت فرما دیا۔ چنانچہ قرآن و حدیث اور کتاب و سنت مل کر نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک وحدت بنتی ہیں۔ اور نبی اکرم صلی اللہ

کے قائم کردہ نظامِ زندگی اور خلافتِ راشدہ کے دورِ سعید کو پوری نوعِ انسانی کے لئے حجتِ کاملہ کا مقام حاصل ہے۔

قرآن مجید کی عظمت و فضیلت کے متعلق امام ترمذی اور امام دارمی رحمہما اللہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں قرآن مجید، فرقان حمید کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ: فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ۔ (اس کتاب اللہ میں) تم سے پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد (وقوع پذیر ہونے والے حالات) کی اطلاعات بھی ہیں (یعنی اعمال و اخلاق کے جو دنیوی و اخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں، قرآن مجید میں ان سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں، قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ بھی موجود ہے"۔ لہٰذا ہر دور کے حالات و واقعات اور مسائل کے حل کے لئے قرآن حکیم، سنتِ مطہرہ، اسوہ حسنہ اور فرموداتِ نبویؐ میں امتِ مسلمہ کے لئے کامل ہدایات و رہنمائی موجود ہے۔ البتہ ایمان و ایقان کے ساتھ کتاب و سنت میں غور و فکر اور تدبر کی ضرورت ہے۔ عالمِ اسلام میں امتِ مسلمہ دینی، اخلاقی اور دنیوی اعتبارات سے جس نکبت، مسکنت، زوال، انحطاط، گھمبیر اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے ان کے متعدد اسباب میں تین کو اوّلیت و اہمیت حاصل ہے۔ ایک ہے مسلمانوں کے تعلق مع اللہ میں ضعف، ایک ہے الھدیٰ یعنی قرآن حکیم سے بُعد — اور ایک ہے اتباعِ سنت سے اعراض و اغماض — الّا ماشاء اللہ۔

امتِ مسلمہ کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالےٰ ایسے رجالِ دین کو اٹھاتا رہا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو ان تینوں اساسی امور کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی ہے۔ بحمد اللہ ہمارے اس دور میں بھی ایسے رجالِ دین اٹھتے رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک عاجز بندہ ڈاکٹر اسرار احمد بھی ان لوگوں میں شامل ہے جس نے اپنی عمرِ عزیز اسی کام کے لئے وقف کر دی ہے اور اللہ تعالےٰ کی توفیق، تائید اور نصرت کے بھروسے پر امتِ مسلمہ پاکستان کو ان امور کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اور اقامتِ دین یا عام فہم اصطلاح میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے مقصد کے لئے انہوں نے ایک تحریک بھی "تنظیم اسلامی" کے نام سے قائم کی ہے۔

اس تنظیم اسلامی کے چھٹے سالانہ اجتماع کے افتتاحی خطاب منعقدہ یکم مئی ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پاکستان کو درپیش پیچیدہ اور پُرخطر حالات پر کتاب و سنت کے حوالوں

سے گفتگو بھی کی ہے اور ان کا حل بھی پیش فرمایا ہے۔ مزید برآں تقرب الی اللہ کے مراتب کے موضوع پر مفصل اظہارِ خیال کیا ہے اور اس کی روشنی میں عالم اسلام بالخصوص پاکستان کے پُرپیچ مسائل کا حل تجویز کیا ہے۔ اس خطاب کے ذریعے سے ان شاء اللہ العزیز تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت اور اس کا طریق کار بھی ایک نئے اسلوب اور انداز سے قارئین کرام کے سامنے آجائے گا۔

اس خطاب کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے حسب ذیل موضوعات مقرر کئے تھے:

● از روئے قرآنِ حکیم:

ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں؟
اور آیا اُن کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن ہے؟

● سُنّتِ رسولؐ کا مقام کیا ہے؟

اور موجودہ دور میں اتباعِ رسول اور احیاءِ سُنّت کے تقاضے کیا ہیں؟

● طریقت اور سلوک کی حقیقت کیا ہے؟

اور تقرب الی اللہ کے ذرائع و وسائل کون سے ہیں؟

● مزید برآں یہ کہ

ملک و ملت کے بقاء و استحکام کے ضمن میں ہم اپنی ذمہ داریاں کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

خطاب میں موضوعات پر گفتگو کی ترتیب البتہ بدل گئی ہے لیکن جملہ امور کا احاطہ ہو گیا ہے۔

ان سطور کے عاجز راقم کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے متعدد دروس و خطاب ٹیپ کے فیتے سے صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق کی ارزانی ہوئی ہے۔ جن میں سے بعض کتابی شکل میں مطبوعہ موجود ہیں۔ تحدیثِ نعمت اور اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ اس خطاب کی منتقلی کے لئے اس عاجز نے اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے

کی حتی الوسع سعی کی تھی۔ الحمد للہ والمنہ یہ خطاب اوّلاً "تنظیم اسلامی" کے پچھلے سالانہ اجتماع کی روداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اسے علاحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس کے افادے کا حلقہ وسیع تر ہو سکے۔

اس احقر کی کوشش تھی کہ محترم ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی فرما لیتے۔ لیکن ارادے کے باوجود اپنی بے انتہا دعوتی و تنظیمی مصروفیات کے باعث وہ اس کام کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ اس کتاب میں جو صواب اور حق ہے وہ منجانب اللہ تعالیٰ ہے۔ جو خطا ہے، فروگزاشت ہے، اظہارِ مدعا میں ابہام ہے اس کی ذمہ داری اس عاجز کے شانوں پر ہے جس کے لئے یہ عاجز صمیم قلب سے بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہے کہ:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ آمین یا رب العٰلمین!

احقر

جمیل الرحمٰن عفی عنہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَحْمَدُهٗ وَاَسْتَعِيْنُهٗ وَاُؤْمِنُ بِهٖ وَاَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ نَفْسِىْ وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِىْ مَنْ
يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ
اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ط اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَ
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا
كَثِيْرًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ط
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا

تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج وَكُنْتُمْ
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ
اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۰۲ تا ۱۰۴)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ وَعَظَنَا
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَةً وَّجِلَتْ مِنْهَا
الْقُلُوْبُ وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ، فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ
كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا قَالَ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى
اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ فَاِنَّهٗ
مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ
بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا
عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ
بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (ابوداؤد والترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ
بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ اَحَبَّ مِمَّا
افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَلَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ
بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ
يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ
بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ

وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ (رواه البخاری)
عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (رواہ احمد والترمذی)
وَصَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ الْكَرِيْمُ

عزیز رفقائے تنظیم اسلامی اور محترم مہمانانِ گرامی!

یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ یہ اجتماع تنظیم اسلامی کے چھٹے سالانہ اجتماع کی پہلی نشست ہے۔ جس کی نوعیت ایک عمومی اجتماع کی ہے۔ اس میں جو باتیں مجھے آپ حضرات کے گوش گزار کرنی ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو رفقائے تنظیم اسلامی کی اکثریت کو غالباً ازبر ہوں گی اور دیگر شرکاء میں سے بھی اکثر حضرات کے حافظے میں کسی نہ کسی درجے میں محفوظ ہوں گی۔ بایں ہمہ اعادہ اور تکرار اور مذاکرہ و تذکار کی اپنی جگہ پر اہمیت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بڑے سے بڑا عالمِ دین بھی قرآن مجید کے مسلسل مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا، چاہے اُسے قرآن مجید کی تعلیمات کتنی ہی ازبر ہوں۔ اسی لیے سورۂ عَبَسَ میں اس کتابِ عزیز کی شان کے بارے میں فرمایا گیا: كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مختلف اقسام کے حالات اور عوامل کے زیر اثر آتا رہتا ہے۔ جس سے اس کی فکر پر، اس کے احساسات پر اور اس کے ذہن و عقل پر بہت سے اثرات مترتب ہوتے رہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سی وہ باتیں جو اس کے نزدیک بالکل واضح تھیں، ان میں کچھ اشتباہ پیدا ہو جائے، کچھ دھندلاہٹ آجائے اور کچھ اس کے شعور سے تحت الشعور میں جا کر گم ہو جائیں۔ کچھ نسیان کی شکار ہو جائیں۔ کچھ پر حجاب پڑ جائے۔ ان تمام باتوں کا لازماً نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان کے عمل میں کچھ تعطل و جمود پیدا ہو گا یا کجی اور بے راہ روی ظاہر ہو گی اور اس کے روز و شب کی مصروفیات و مشاغل میں اپنے مقصد اور نصب العین کے لیے اتنی لگن، سعی و جہد،

محنت و کوشش اور ایثار و قربانی نظر نہیں آئے گی جتنی پہلے نظر آرہی تھی۔ یا جو مطلوب ہے۔

تذکیر مقصود ہے

لہٰذا یاددہانی بلکہ مسلسل یاددہانی کی ضرورت رہتی ہے۔ جو باتیں مجھے آج عرض کرنی ہیں، وہ نئی باتیں نہیں ہوں گی، میں اُن کو مختلف اسالیب و دلائل کے ساتھ متعدد بار پہلے بھی اپنے دروسِ قرآن حکیم اور اپنی تقاریر میں بیان کرتا رہا ہوں۔ آج کی اس نشست میں وہی باتیں بطور تذکیر اور یاددہانی قرآنِ حکیم کی چند آیاتِ مبارکہ جن کی میں نے ابتداء میں تلاوت کی ہے اور چند احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جو میں نے آغاز میں آپ کو سنائی ہیں، ان کے حوالوں سے ایک نئے پہلو اور اسلوب (DIMENSION) سے آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کرنے کا اس دعا کے ساتھ ارادہ رکھتا ہوں کہ: رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ۔

مجھے توقع ہے کہ آپ تمام حضرات اس امر سے واقف ہوں گے کہ میں قرآن مجید، فرقانِ حمید کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میرا فکر، میرا نظریہ، میرا نصب العین اور میرا طریق کار، میرے فہم کی حد تک کتاب اللہ اور اُس کی عملی تفسیر و تعبیر سنتِ رسول اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعے اور غور و تدبر سے ماخوذ ہے۔ مجھے اس موقع پر علامہ اقبالؒ کا یہ مصرع بے اختیار یاد آرہا ہے کہ ؏ گوہرِ دریائے قرآن سُفتہ ام۔ "میں نے قرآن حکیم کے بحرِ ذخار ہی سے کچھ موتی نکالے ہیں"۔

جب بڑے سے بڑا صاحبِ علم قرآن مجید کی مسلسل تلاوت سے مستغنی نہیں ہو سکتا تو ہم تو خاص طور پر قرآن مجید کے اس سبق کی بار بار تذکیر کے محتاج ہیں جس کا از روئے ایمان ہر مسلمان کو جاننا فرض ہے تاکہ ہمیں ہمارے مقصدِ وجود و تخلیق کی بار بار یاددہانی ہوتی رہے اور ہمارے سامنے دینی فرائض جن میں تعبدی اُمورؒ سے لے کر منصبیؒ اُمور تک شامل ہیں وضاحت کے ساتھ بتکرار آتے رہیں۔

ؒ مراد ہیں: صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج = ارکانِ اسلام (مرتب)

ؒ اگلے صفحہ پر دیکھیے:

دین کی ہمہ گیری

جو حضرات تنظیم اسلامی میں شامل ہیں، اُنھوں نے اس بات کو ذہناً قبول کر کے تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے کہ بندۂ رب ہونے کی حیثیت سے ان پر فرض عبادات بجالانا بھی لازم اور پوری زندگی میں اوامر و نواہی اور حلال و حرام کی پابندی بھی لازم ہے ۔۔۔ پھر خاتم النبیین، آخر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ دین، شہادت علی الناس اور اقامت و اظہارِ دین الحق کے لیے مجاہدہ اور حالات کے تقاضوں کے تحت مقاتلہ بھی ان کے فرائض منصبی میں شامل ہیں مزید براں یہ کہ ان فرائض کی بجا آوری کے لیے سمع وطاعت کے اسلامی اصولوں پر التزام جماعت بھی دین کی ذمہ داریوں کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ آج کی میری گفتگو ان کے لیے تذکیر و اعادہ ہو گی اور دیگر شرکاء کے لیے تذکیر کے ساتھ ایک دعوت اور ایک پکار کی حامل ہو گی۔

اظہارِ تشکر

میں آپ حضرات کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں کہ میری استدعا پر اتنی کثیر تعداد میں، اس گرمی کے موسم میں اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر شہر سے کافی دُور قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن میں آپ حضرات تشریف لائے۔ تشکر یہ کے یہ الفاظ محض رسمی نہیں ہیں بلکہ میرے دلی جذباتِ تشکر کے ترجمان ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی تعمیل ہے کہ: مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرُ اللّٰہَ" جو انسانوں کا (ان کے احسان پر) شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔"

آپ تشریف لائے ہیں اور آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا ہے کہ میں اپنے دل کا کچھ درد آپ کے سامنے رکھوں۔ اگر آپ تشریف ہی نہ لاتے تو ظاہر بات ہے کہ مجھے یہ موقع میسر ہی نہ آتا۔

لے مراد ہیں: تبلیغ، دعوت، شہادت علی الناس، اقامتِ دین، اظہارِ دین الحق اور اعلائے کلمۃ اللہ اور سب سے بڑھ کر مجاہدہ مع النفس (مرتب)

استماع کی درخواست

اب ایک مزید درخواست ہے کہ میری معروضات توجہ کے ساتھ سنیے۔ قرآن مجید میں سورۃ الزمر میں مقام مدح کے طور پر یہ الفاظ مبارکہ آئے ہیں کہ: اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰٓئِكَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ”جو لوگ بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت (کی توفیق) عطا کی ہے اور یہی دانش مند ہیں۔“ سَمِعَ، یَسْمَعُ مجرد سننے کے لیے آتا ہے۔ اِسْتَمَعَ یَسْتَمِعُ بابِ افتعال میں جب آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے پوری توجہ سے سننا۔ کان لگا کر سننا۔ یہی لفظ خاص طور پر قرآن مجید کے لیے آیا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الاعراف ۲۰۴) ”جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے تو اُسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحمت ہو جائے۔“ سورہ الزمر میں یَسْتَمِعُوْنَ کا لفظ آیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بات کو توجہ اور حضورِ قلب کے ساتھ سُنا جائے۔ اس کے بعد فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی بات کو توجہ اور غور سے سُنیں اور پھر اس میں جو بہترین بات سامنے آئے اُس کا اتباع کریں۔ اس آیت مبارکہ میں فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ کا جو ٹکڑا آیا ہے، اس کے متعلق میری یہ رائے جان لیجیے کہ بہت کم لوگوں کی اس کے مفہوم تک رسائی ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کی تو تمام باتیں ہی احسن ہیں۔

استماع کے مراتب

لیکن اس میں بھی مراتب و درجات ہیں۔ جس طریقہ سے فہم و شعور کے مختلف مراتب و درجات ہیں، اُسی طریقے سے عملی زندگی کے بھی مراتب و درجات ہیں۔ جیسے ’اسلام‘ ہے۔ اس سے بلند درجہ ’ایمان‘ ہے اور بلند ترین، ارفع و اعلیٰ درجہ، رتبہ اور مقام ”احسان“ ہے۔ تو جو لوگ بات کو خوب غور سے اور کان لگا کر سنیں اور جو باتیں سامنے آئیں، ان میں سے بہترین بات کے اتباع کا دل میں جذبہ و داعیہ پیدا کریں اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کا عزم بالجزم کر کے پیش قدمی شروع کر دیں یا کم از کم کوشش ہی کا آغاز

کردیں۔ کم تر کی طرف دھیان نہ دیں۔ یہ نہ سوچیں کہ کم سے کم کتنے میں گزارا ہوتا ہے جیسا کہ ہمارا معاملہ دنیا میں ہے کہ ہم آگے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ کم سے کم کتنے میں گزارا ہوتا ہے۔

مسابقت کا اصل میدان یہ معاملہ اصلاً دین میں ہونا چاہیئے کہ دین میں زیادہ سے زیادہ کتنے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ادنیا میں کم سے کم پر گزارا کیا جائے لیکن دین کے معاملے میں طرزِ عمل یہ ہو کہ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ۔ جو دین کا بہترین مقام اور سطح اور اس کا جو اعلیٰ وارفع درجہ سامنے آرہا ہے اس کی پیروی کی کوشش کی جائے۔ اسی آیت کے آخری ٹکڑے میں ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بشارت دی گئی ہے کہ أُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ط۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کو مختلف دل نشین اسالیب سے پیش کرتا ہے۔ احسن قول کے دھیان سے سننے اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرنے کی ترغیب وتشویق کا ایک انداز یہاں اختیار کیا گیا۔ ایک دوسرا اسلوب سورہ المؤمنون میں اس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے کہ آیات ۵۶ تا ۶۰ میں مومنینِ صالحین کے چند صفات بیان کرکے فرمایا گیا:
أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝ (آیت ۶۱) "یہی ہیں وہ لوگ جو بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کرکے ان کو پانے والے ہیں۔"

دو طرح کے انجام انسان کو اس دنیا کے اعمال کے نتیجے میں آخرت میں دو طرح کے انجاموں سے واسطہ پڑے گا۔ پہلا انجام ہے بدکاروں کا۔ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ۔ پھر قرآن سجین کی ہولناکیاں بیان کرتا ہے۔ دوسرا انجام ہے نیکوکاروں کا۔ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ـــ پھر علیین میں جو انعام واکرام ہیں ان کو بیان کرتا ہے اور

ترغیب و تشویق دلاتا ہے کہ : وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس (انعام و اکرام) کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں "۔ انسان میں مسابقت کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ قرآن اس کو شوق دلاتا ہے کہ خیر کے کاموں میں سبقت کا رویہ اختیار کرو ___ یہی رشد و ہدایت اور فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ [۱]

لہٰذا میں مستدعی ہوں کہ دل میں ایک ارادہ اس دُعا کے ساتھ پیدا کیجیے کہ اے اللہ! جو حق ہے، اس کے لیے ہمارے سینوں کو کھول دے اور ہمیں عملاً اس کے اختیار کرنے کی توفیق عطا فرما۔ احسن قول کے اتباع اور خیر کے کاموں میں مسابقت کا جذبہ ہمارے دلوں میں پیدا فرما۔

اس خطاب کے موضوعات

اس تمہید کے بعد میں عرض کر دوں کہ اس اجتماع میں تقریر کے عنوان کے ذیل استفہامی موضوعات کے بارے میں جو اخبار کے اشتہار اور دعوتی ہینڈبل میں درج ہیں، مجلہ سے بعض احباب نے باقاعدہ یہ بات کہی ہے کہ اتنے سارے موضوعات آپ نے دیئے ہیں۔ آپ کتنی طویل تقریر کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ان حضرات کا سوال وزنی ہے۔ ان سوالات سے یہ تاثر فی الواقع ذہن میں قائم ہوتا ہے کہ اتنے اہم اور بنیادی سوالات پر، پھر اتنے مختلف سوالات کہ از روئے قرآن حکیم ہمارے دینی فرائض کیا ہیں؟ اور آیا ان کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن ہے؟ سنتِ رسولؐ کا مقام کیا ہے؟ اور موجودہ دور میں اتباعِ رسولؐ اور احیائے سنت کے تقاضے کیا ہیں؟ طریقت اور سلوک کی حقیقت کیا ہے؟ اور تقرب الی اللہ کے ذرائع اور وسائل کون سے ہیں؟ پھر ان

---

[۱] نبی اکرمؐ کے ایک قول کا مفہوم ہے کہ دنیا کے معاملے میں اپنے سے نیچے کو دیکھو تاکہ شکر کا جذبہ پیدا ہو اور دین کے معاملے میں اپنے سے آگے کو دیکھو تاکہ مسابقت، کا جذبہ اُبھرے۔ (مرتب)

سب سے علیٰحدہ مسئلہ یہ کہ اس مملکتِ خداداد، اس عطیہ خداوندی پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہمارے کیا فرائض ہیں!! آیا انفرادی اعتبار سے فرداً فرداً ہم ان ذمّہ داریوں کو ادا کر سکتے ہیں یا اس کے لیے کسی ہیئت اجتماعیہ میں شمولیت ضروری ہے۔ جس کے بغیر ہم ان ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے!! الغرض بے شمار مسائل ہیں اور بہت سی باتیں ہمارے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ لیکن ایک بات جان لیجیے کہ حقیقتِ اصلیہ ایک 'وحدت' ہوتی ہے اسی کے مختلف پہلو ——— (ASPECTS) ہوتے ہیں۔ جیسے جنت کے بارے میں فرمایا کہ 'اس کے بہت سے دروازے ہیں۔ کوئی کسی ایک دروازے سے داخل ہوگا کوئی دوسرے سے۔ سب جنت ہی میں پہنچیں گے'، اسی طرح جہنم کے بھی بہت سے دروازے ہیں۔ پس یہ مختلف مسائل دراصل ایک ہی مسئلے کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ مسئلہ سمجھ میں آجائے تو ہر چیز اپنی جگہ موزوں (FIT) ہوتی نظر آئے گی ——— بہرحال میں اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے اس خوش فہمی کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں کہ ان تمام سوالات کے بارے میں جو آج کی اپنی تقریر کے لیے میں نے متعین کیے ہیں۔ اُن کی جو اساسات ہیں، جن پر آگے فکر تعمیر ہوتی ہے جیسے کہا مولانا رومؒ نے ع ایں قدر گفتیم باقی فکر کن۔ عاقل و بالغ اور تعلیم یافتہ حضرات اس بات کی احتیاج نہیں رکھتے کہ ان کو ایک ایک حرف پڑھایا جائے۔ بنیادی و اساسی باتیں ایسے حضرات کے سامنے بیان کر دی جائیں تو وہ آگے اپنے طور پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے میں اللہ تعالیٰ سے دُعا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے بات شروع کر رہا ہوں ——— لیکن میں ترتیب بدل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کی تقریر کے نکات میں سے آخری نکتے پر پہلے بات کر دوں۔ جس کے لیے اعلان میں یہ الفاظ دیئے گئے ہیں کہ "ملک و ملّت کے بقا اور استحکام کے ضمن میں ہم اپنی ذمّہ داریاں کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟" اس کی وجہ یہ ہے کہ میں گزشتہ ایک سال کے دوران متعدد مواقع پر اس موضوع پر بڑی مفصل گفتگوئیں کر چکا ہوں۔ لہٰذا مجھے

اس مسئلے پر صرف چند باتیں عرض کرنے پر اکتفا کرنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ یہ ایک اعادہ ہوگا اور بات تازہ ہو جائے گی۔ پہلی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس معاملے میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کے قیام کا جواز بھی کوئی نہیں ہے دین کے سوا۔ اور پاکستان کے استحکام کا معاملہ تو بہت آگے ہے۔ بقاء تک کا کوئی امکان نہیں ہے دین کے سوا ــــ اب اس دعوے کے دلائل و شواہد اور تفصیلات پر کئی گھنٹے تقریر ہو سکتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ ناقابل تردید واقعہ ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کیلئے اس کو ایک طرف رکھیے کہ یہ واقعہ ایک تہائی صدی پہلے ظہور پذیر ہوا تھا۔ اب غور کیجیے تو کوئی بنیاد، کوئی اساس، کوئی مرکز اور کوئی محور اس ملکِ پاکستان کے بقاء اور استحکام کے لیے نہیں ہے سوائے دین کے۔[۱]

وطنی قومیت کی نفی

اچھی طرح جان لیجیے کہ ایک 'مسلم قومی ریاست' (MUSLIM NATIONAL STATE) کی حیثیت سے پاکستان کے مستحکم ہونے اور اس کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک 'مسلم قومی ریاست' کے لیے اسلام کے علاوہ کسی "قومیت" (NATIONALISM) کی بنیاد ضروری ہے۔ ورنہ آپ "اسلامی ریاست' (SILAMIC STATE) کیوں نہ کہئے!۔ جب آپ نے تین الفاظ استعمال کیے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کو کوئی اور نیشنلزم (قومیت) درکار ہے۔ لیکن میں بلاخوف لومت لائم آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس قومیت (NATIONALISM) کے لیے سرے سے کوئی عامل موجود ہی نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ قومیت (NATIONALISM) کے لیے جو

---

[۱] ان موضوعات و مباحث پر مفصل گفتگوؤں کا ایک مختصر لیکن جامع مرقع "استحکامِ پاکستان" کے نام سے دو جلدوں میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

عوامل ضروری ہوتے ہیں ان میں سے کون سا عامل ہمارے پاس ہے ۔؟ نہ تاریخی تسلسل ، نہ نسلی تعلق ، نہ لسانی اساس اور نہ ہی تہذیبی ، تمدنی اور ثقافتی رشتہ ۔ اب رہ گئی وطنی قومیت (TERRITORIAL NATIONALISM) تو اس کے خلاف جہاد کر کے تو آپ نے یہ ملک بنوایا ہے ۔ وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کے تصور کی کامل نفی پر تو پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ آخر علامہ اقبال مرحوم کی جن کو حکیم الامت جیسے معزز خطاب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ یہ تعلیمات ذہن سے کیسے محو ہو سکتی ہیں کہ ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔۔۔ ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ۔۔۔ تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے ۔۔۔ غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے ۔۔۔ اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

پھر علامہ اقبال مرحوم نے ہی وقت کے ایک جید عالم دین اور مردِ حریت پسند کے اس قول پر کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں یہ بات کہی تھی کہ ؎

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

وطنی اور علاقائی قومیت کی مضرت

پھر وطنی و علاقائی قومیت کی خطرناکی ہمارے سامنے آ چکی ہے ۔ اسی وطنی قومیت کے نعرے پر جس کی پشت پر لسانی ، تہذیبی اور جغرافیائی

عوامل کی مدد بھی موجود تھی۔ ہمارا ملک دولخت ہو چکا ہے۔ موجودہ پاکستان میں بھی یہ فتنے سندھی قومیت، بلوچ قومیت، پختون قومیت کی صورت میں سر اُٹھا چکے ہیں۔ یہ فتنے ختم نہیں ہوئے بلکہ مارشل لاء کے خوف سے فی الحال دبکے ہوئے ہیں۔ اگر یہ دوبارہ اُبھرے تو خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی تباہی سے ملک کو سابقہ پیش آئے گا۔! ان مسائل پر میں متعدد بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ یہاں جو شرکاء ہیں، ان میں سے کسی کو بھی اس میں اشتباہ ہوگا کہ وطنی قومیت (TERRITORIAL NATIONALISM) ہمارے درد، دکھ اور مصیبت کا مداوا اور درمان نہیں بلکہ ہماری وحدت اور اتحاد کے لیے سمِّ قاتل ہے۔ یہ ملک نہیں رہ سکتا۔ اگر اسلام نہ ہو۔ ہمارے لیے دین کے سوا کوئی سہارا نہیں، کوئی امریکہ اس کو بچا نہیں سکتا۔ کوئی پٹرو ڈالر اس کے لیے محافظ نہیں بن سکتا۔ سہارا اگر ہے تو وہ ایک ہی ہے (THE ONLY WAY) اور وہ ہے ہمارا دینِ اسلام

اسی بات کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں کہا تھا ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

یہ معاملہ باقی مسلم ممالک کے لیے اتنا گمبھیر نہیں ہے جتنا ہمارے لیے ہے۔ ترکوں کے لیے ترک نیشنلزم ہے۔ عربوں کے عرب نیشنلزم ہے۔ کہیں نسلی وحدت ہے تو کہیں لسانی وحدت ہے جو نقطۂ ماسکہ بنی ہوئی ہے۔ جوڑنے والی چیز بنی ہوئی ہے اور یہاں کچھ نہیں ہے سوائے دین کے اور اسلام کے۔

نعروں کا اسلام نہیں چلے گا

پھر یہ کہ اسلام اور دین نعرے کا نہیں چلے گا۔ بہت چل چکا۔ اس میں جب تک رُوح اور جوہر (ESSENCE) نہیں ہوگا۔ حقیقت نہیں ہوگی۔ واقعہ نہیں ہوگا۔ تو محض نعروں سے یہ نہ قائم ہوگا اور نہ چل سکے گا۔ اور اب تو شاید نعرے بھی بے اثر ثابت ہوں۔ اس وقت اس ملک کی جو صورتِ حال فی

الواقع ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس ملک کی سالمیّت (INTEGRITY) کو فوج نے سہارا دیا ہوا ہے[1]۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے لیے مارشل لاء ناگزیر اور لابدی ہے تو گویا یہ اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ عوامی سطح پر اس ملک کے رہنے والوں کی رائے کی بنیاد پر ہمیں اعتماد نہیں ہے کہ ایسی صورت میں یہ ملک قائم رہ سکتا ہے۔ ورنہ مارشل لاء کوئی مثالی و معیاری حالت تو نہیں ہے۔ جو شخص بھی سیاسیات کی ابجد سے کوئی معمولی سی شُدبُد رکھتا ہو۔ وہ یہ بات کہہ ہی نہیں سکتا کہ مارشل لاء ایک نارمل صورتِ حال ہے۔ پس غور کیجیے کہ آخر فوج کب تک سہارا دے گی۔ ! اس کا جو حقیقی و واقعی اور صحیح سہارا ہے اگر وہ قائم نہیں ہوتا اور اس کو تو وعدۂ فردا پر ٹالا جاتا رہا اور وعدے وعید ہی ہوتے رہے۔ وہی باتیں کہی جاتی رہیں جو قوم ایک تہائی صدی سے سنتی چلی آ رہی ہے کہ "ہوگا"، "کریں گے"۔ "بڑے گمبھیر مسائل ہیں۔ بڑی پیچیدگیاں اور دشواریاں ہیں۔ ان پر قابو پانے کی تدابیر ہو رہی ہیں" وغیرہ وغیرہ تو جان لیجیے کہ زبانی کلامی اسلام نہیں چلے گا اور نہ طفلانہ تسلیاں زیادہ دن چل سکیں گی ——

معلوم یہ ہوا کہ اگر کسی شخص کو اس ملک کی بقا اور استحکام سے کوئی ذہنی و قلبی لگاؤ ہے اور اس میں اس تعلقِ خاطر اور فکر کو دین کے منافی نہیں سمجھتا۔ انسان جہاں رہتا ہو، اس کے بھی چند حقوق ہیں جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ہمارا دین تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس راستے پر تم چلتے ہو اس کے بھی حقوق تم پر قائم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ تمہارے گھر پر اگر کوئی حملہ آور ہو اور تم اپنی آبرو اور اپنے مال کی حفاظت میں اپنی جان دے دو تو تم شہید کا رتبہ پاؤ گے مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ انسانی زندگی کے امن و سکون سے متعلق تمام معاملات کے لیے ہمارے دین کے فلسفہ و حکمت میں ایک مقام معین ہے۔

اصل اسلام کا احیاء درکار ہے

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ جس کسی کو بھی اس ملک کے ساتھ کوئی ذہنی و قلبی لگاؤ

[1] خیال رہے کہ یہ تقریر یکم مئی ۱۹۸۱ء کی ہے۔ (مرتب)

ہے۔ اس کو جان لینا چاہیئے کہ اس ملک کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے جو کام اُسے کرنا ہے تو وہ ہے اصل اور حقیقی دین کا احیاء۔ زبانی کلامی نہیں۔ حقیقی اور واقعی احیاء۔ فکری سطح پر بھی اور عملی سطح پر بھی ——— یہی واحد راستہ (THE ONLY WAY) ہے اس ملک کی بقا اور استحکام کا ـــ باقی وقتی مسائل درپیش آتے رہتے ہیں جیسے ہماری خارجہ پالیسی کیا ہو! داخلی معاملات کی اصلاح اور بہتری کی صورت کیا ہو! اصلاح کے عمل میں تدریج کیا ہو! ترجیحات کن معاملات کو دی جانی چاہیئے۔ ہر باشعور شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مسائل کے بارے میں سوچے، غور کرے۔ اگر اللہ نے صلاحیت دی ہے تو ملک کے جرائد میں اظہارِ رائے کرے۔ اپنے دماغ کو تالا لگائے رکھنا درست نہیں ہے۔

اظہارِ خیال کی آزادی کی اہمیت

اسی طرح صحت مند طریق پر اظہار رائے پر پابندی اور قدغن بھی صحیح نہیں ہے۔ اس طور پر قومی شعور کی تربیت اور تعمیر ہو سکے گی۔ یہ سنسر وغیرہ کے معاملات بھی حکمت کے منافی ہیں۔ آپ شہریوں پر اعتماد کیجیے اور ان کو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اظہار رائے کا موقع دیجیے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اندر ہی اندر مواد پکتا رہے اور اچانک اس طرح پھوٹ پڑے کہ کچھ بنائے بن نہ پڑے۔ انتخابات فی الوقت ہوں یا نہ ہوں! طریقہ انتخاب کیا ہو! صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی ہو! ـــــ اس قسم کے مسائل پر باشعور لوگوں اور دانش وروں کو اظہار رائے کی آزادی ملنی چاہیئے ـــ لیکن یہ تمام معاملات ثانوی ہیں۔ اصل میں اس درخت کی جڑ ہے دین۔ اگر آپ اس کی آبیاری کر رہے ہیں تو آپ اس ملک کی بقا اور استحکام کی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں۔

ہماری خوش بختی

میں نے یہ بات پہلے بھی عرض کی ہے آج اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ ہماری ایک بڑی خوش قسمتی تھی، جس کو ہم نے اپنے غلط طرزِ عمل سے بہت بڑی بدبختی میں تبدیل (CONVERT) کر لیا

ہے۔ ہمارے لیے خصوصی خوش قسمتی یہ تھی کہ ہمارا ملک بھی اسلام۔ جیسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب ان کی ولدیت کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا تو وہ جواب میں فرماتے۔ سلمان ابن اسلام۔ یہی بات یہاں منطبق کی جا سکتی ہے۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر اسلامی نظام کے لیے قائم ہوا تھا لہٰذا "پاکستان ابن اسلام" کہنا درست ہوگا۔ ہماری قومیت بھی اسلام۔ ع 'اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔' یہ کسی اور کے لیے پورے طور پہ صحیح ہو یا نہ ہو، ہمارے لیے ہے۔ پس ہماری وطنیت اسلام۔ ہماری قومیت اسلام ــــ ہمارا دین اسلام ــــ یہ یکجہتی جس کو میسر آگئی ہو، آپ سوچیے اس سے بڑا خوش قسمت انسان کوئی اور ہوگا! اب کوئی مسلمان امریکہ میں جا کر آباد ہو گیا ہے وہاں کی اُس نے شہریت لے لی ہے۔ اب امریکی شہری ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں کچھ اور ہیں۔ ان کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک شخص ہے جو ہندوستان میں رہتا ہے اس کے بال بچے وہاں ہیں۔ وہاں اُس نے سر چھپانے کو کوئی گھروندا بنایا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں اُسے سرکاری ملازمت ملی ہوئی ہو۔ اگر کسی اعلیٰ منصب پہ فائز ہے تو اس نے ہاتھ اُٹھا کر اس کے دستور، آئین اور اس ملک سے وفاداری کا حلف بھی اُٹھایا ہوا ہے۔ لیکن جب کبھی پاکستان اور ہندوستان میں کشیدگی نازک صورت حال اختیار کر لیتی ہے تو وہاں کا مسلمان کس قدر متضاد دباؤ (PRESSURE) کے تحت آتا ہوگا۔ کیسا تخالف (CONFLICT) ہوتا ہوگا کہ اس کا دل اسلامی اُخوت کے رشتے کی وجہ سے پاکستان کے ساتھ ہوتا ہوگا لیکن وہ اپنے اس حلف کی وجہ سے پابند ہے کہ وہ اپنے ملک کی منفعت کو سامنے رکھے۔ اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے لیے کتنی خوش بختی تھی کہ پاکستان کی خدمت، دین کی خدمت بن سکتی تھی لیکن فزیالوجی کا جو قانون (ALL OR NONE LAW) ہے اُس کو ہم نے اپنے خلاف استعمال کر لیا۔ دین کو مستحکم نہیں کیا تو ہمارے پاس کوئی اور بنیاد رہے ہی نہیں۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ مذہب کی بنیاد پہلی ہے، قومیت کی بنیاد دوسری ہے، وطنیت کی بنیاد تیسری ہے تو اگر مذہب کمزور ہے تو دوسری دو بنیادیں قومیت و وطنیت تو مضبوط ہیں ان ہی میں سے کسی کے سہارے پہ کھڑے ہو جائیں گے لیکن

حال یہ ہے کہ یہ بنیادیں بھی دین پر قائم ہیں لہذا ان میں سے بھی کوئی بنیاد دین کے بغیر مضبوط ہو ہی نہیں سکتی ۔

دین سے صحیح تعلق کی اہمیت

حاصل یہ نکلا کہ اگر دین سے ہمارا تعلق درست نہیں ہوتا تو ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ یہ ہے صورت حال جس سے فی الواقع ہم دوچار ہیں اور یہ باتیں دو اور دو چار کی طرح کی حقیقتیں ہیں۔ میں ان کو متعدد بار عرض کر چکا ہوں۔ لہذا آگے میں جو گفتگو کرنے والا ہوں جس کا سارا تعلق (REFERENCE) دین سے ہے کہ ہمارے دینی فرائض کیا ہیں اور صحیح دینی تصورات اصلاً کیا ہیں! ان کے متعلق یہ جان لیجیے کہ میرے مطالعے اور میری رائے کے اعتبار سے یہ صرف کوئی مذہبی بات یا محض وعظ نہیں ہے بلکہ اس ملک کے بقا اور استحکام کے متعلق میں جو ذمہ داری ادا کر سکتا ہوں، وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

اصل الاصول ــ تقویٰ

میں نے آج آغاز میں سورہ آل عمران کی تین آیات کی تلاوت کی ہے اور تین ہی احادیث آپ کو سنائی ہیں۔ اب میری کوشش ہوگی کہ ان پر ایک خاص ترتیب سے بات کروں اور اس میں بھی سب سے پہلے میں اس پر روشنی ڈالوں گا کہ سنّت کیا ہے! اتباعِ سنّت کا مقام کیا ہے! اور احیائے سنّت کا مرتبہ کیا ہے! اس کو ہم حضرت عرباض ابن ساریہؓ کی حدیث سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پہلی حدیث ہے جو آج میں نے آپ کو سنائی۔ وہؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اور نصیحت ایسی تھی کہ اس سے قلوب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ لرز کر رہ گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ تو ہمیں ایسے لگ رہا ہے جیسے آپؐ نے الوداعی نصیحت فرمائی (کہیں آپؐ ہم سے رخصت تو نہیں ہو رہے! اور اگر یہ اس نوعیت کی کچھ بات ہے) تو ہمیں (مزید) وصیت فرمائیے، (کہ ہم آپؐ کے بعد کیا کریں؟ اگر آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت ہے تو آپؐ کے بعد ہمارا سہارا کون ہوگا؟)" اس پر آپؐ نے فرمایا: اُوْصِیْکُمْ

بِتَقْوَی اللّٰہ ۔ "میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔" دیکھئے ہم نے سورۂ آلِ عمران کی جو آیات پڑھیں۔اس کی پہلی آیت میں بھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے: یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

سمع و طاعت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی وصیت اللہ کے تقویٰ کی فرمائی۔بعدہٗ فرمایا: "اور میں تمھیں وصیت کرتا ہوں سمع و طاعت کی" یعنی سننے اور ماننے کی۔نظم کی پابندی ہو، افتراق اور تفرقہ نہ ہو۔" سورۂ آل عمران کی دوسری آیت میں تفرقے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ وہاں فرمایا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ قرآن و حدیث میں کوئی فرق اور بُعد نہیں ہے وہی بات ہے کہ ع گوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام ــــ حدیث دراصل قرآن ہی کی تبیین و تفہیم ہے۔ الفاظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔مفہوم کُل کا کُل قرآن حکیم کا ہے۔ترتیب وہی ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ ــ "میں تمھیں اللہ کے تقوے اور سمع اور طاعت کی وصیت کرتا ہوں خواہ تمھارا امیر ایک غلام ہی کیوں نہ ہو" یعنی کسی غلام کا امیر و حاکم بننا تمھارے نفس پر بڑا شاق گزر سکتا ہے اور تمھارے لیے کٹھن امتحان بن سکتا ہے کہ ہم آزاد اور یہ غلام یا غلام زادہ۔یہ ہم پر امیر ہو گیا! کیسے ہو گیا! ــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ھ میں ایک جیش کا امیر اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کو بنایا اور حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں روم کی سرحدوں کے جانب بھیجے جانے والے جیش کا امیر حضرت اسامہؓ ابن زیدؓ کو بنایا جن کی ماتحتی میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب بھی تھے ــ اس پر قریش کے بعض اہلِ ایمان حضرات نے دبی زبان سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اسی سے قیاس کر لیجیے۔عرب کا ذہن یہ تھا کہ اگر غلام آزاد بھی ہو جائے تو اس کو وہ اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے،

وہ موالی شمار ہوتا تھا۔ غلامی اور آزادی کے درمیان (IN BETWEEN) کا کوئی مقام ان کے ذہن میں ہوتا تھا۔

مشعلِ راہ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِنَّہٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا

"تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا۔ وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا۔"

اُن اختلافات کے زمانے میں تمہارے لیے مشعلِ راہ (TORCH LIGHT) کون سی ہے! تمہارے لیے روشنی کا مینار کون سا ہے! فرمایا: فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ "یہاں کلمہ "فا" بہت معنی خیز ہے۔ یہ ان اختلافات کے لیے جائے پناہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ جائے پناہ صرف یہ ہے کہ "پس تم پر واجب ہے، لازم ہے میری سنّت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنا"۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کا تتمہ ہے خلفائے راشدین المھدیّین کی سنّت۔ ایک دوسرے مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ۔ جب اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی[1] تو ان میں ناجیہ فرقے کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلع فرمادیا کہ ناجیہ فرقہ کا طرزِ عمل ہوگا کہ: مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ "وہ لوگ جو التزام کریں گے کہ معلوم کریں کہ میرا طریق کیا تھا اور میرے صحابہ کا طریق کیا تھا"۔ لیکن جس حدیث کے معانی و مفاہیم کی میں اس وقت تشریح کر رہا ہوں۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ہمارے ہاں جو فقہی مذاہب پائے جاتے ہیں جیسے مذہب مالکی، مذہب حنفی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی، مذہب سلفی اور مذہب ظاہری (اہل حدیث) تو یہ اصلاً فرقے نہیں ہیں بلکہ مکاتیبِ فکر اور فقہی مسالک و مذاہب ہیں۔ ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک ہی فرقے اہل سنت والجماعت کے فروعات ہیں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے آپس میں غلو اور تشدّد اختیار کر لیا ہے اور افراط و تفریط کا یہ عالم ہے کہ اب فی الوقت یہ فرقے بن گئے ہیں۔ (مرتب)

نے اپنی سنت کے ساتھ خلفاء راشدین المہدیین کی سنت کو بھی ملحق فرمایا ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ کا معاملہ تو انفرادی اور خاص (INDIVIDUAL) ہوگا:
اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ۔ اور ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ صحابہؓ میں ایک میں زہد کا رنگ غالب ہے۔ ایک میں مجاہدے کا رنگ غالب ہے۔ کسی کو انفاق سے زیادہ انس ہے۔ کوئی نمازیں زیادہ پڑھنے سے مناسبت رکھتا ہے تو ان کے رنگ مختلف ہیں لیکن جماعتی حیثیت سے سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام متشکل ہو کر سامنے آتی ہے۔ خلفائے راشدین المہدیین میں۔ اس لیے کہ یہ وہ دور تھا کہ پوری اُمتِ محمدیہؐ ایک وحدت تھی، کوئی افتراق نہیں تھا۔ یہ وحدت بھی موجود تھی کہ دینی اور مذہبی قیادت بھی خلفائے راشدین المہدیین کے ہاتھ میں اور سیاسی قیادت و حکمرانی بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ پوری اسلامی مملکت ایک ہی ہے۔ مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ مملکتیں نہیں ہیں۔ ایک ہی نظام ہے جو پوری مملکت اسلامیہ میں جاری و نافذ ہے۔ لہٰذا اس وقت جو فیصلے ہوئے یعنی خلفائے راشدین المہدیین کے اجتہادات اگر ان کو اُمت نے تسلیم کر لیا جن میں اکثریت صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی تھی تو ان کے اجماع ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا ان فیصلوں کی حیثیت مجمع علیہ سنت کی ہو گی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ میرے نزدیک فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سنۃ الخلفاء الراشدین المهدیین کی یہ احسن اور صحیح تعبیر ہے۔ مزید براں خلافتِ راشدہ نبوت کا تتمہ و تکملہ ہے اسی لیے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔
آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امر کے صیغے میں حکم دے رہے ہیں کہ عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ" اسے اپنے دانتوں کی کچلیوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو"۔ معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ بڑے دباؤ آئیں گے حالات کا رُخ کچھ اور ہو گا۔ ان میں سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سنتِ خلفائے راشدین المہدیین کو بڑی مضبوطی سے تھامنا ہو گا۔ آگے فرمایا: وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔" اور دیکھنا نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے سے بچنا۔ کیونکہ دین

میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہو گی اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔"

سنت کا ہمہ گیر تصوّر

اس حدیث کو ذہن میں رکھیے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک حدیث مزید سناؤں۔ ابھی ہم نے جس حدیث کے مفاہیم و معانی اور مطالب کو سمجھا ہے۔ یہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ کرام سے بطور وصیت چند ہدایات ارشاد فرمائیں۔ دوسری بات ایک اصول کے اعتبار سے دَور کے زمانے سے متعلق ہے۔ یعنی جب وہ دَور آئے کہ اُمت میں فساد رونما ہو چکا ہو۔ بدعات کے ہجوم میں سنّت گم ہو گئی ہو۔ اس وقت مسلمان کیا روّیہ اختیار کریں؟ صحابہ کرامؓ کا زمانہ تو وہ تھا کہ جس میں سنّت ایک خورشید کے مانند نصف النہار پر چمک رہی تھی۔ لیکن ایک دَور ایسا بھی آسکتا ہے کہ سنت بدعات میں گم ہو جائے۔ بدعات کا اتنا انبار ہو کہ اس میں تلاش کرنا مشکل ہو جائے کہ سنّت کیا ہے؟ اس دَور کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَحْیٰی سُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَہٗ اَجْرُ مِائَۃِ شَھِیْدٍ "جب میری اُمت میں فسادِ عمومی ظاہر ہو چکا ہو، اُس وقت جو شخص میری سنت کو زندہ کرے تو اس کے لیے سو شہیدوں کا اَجر ہے"۔ اب ان دونوں حدیثوں کو سامنے رکھیے اور بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سنت کا لفظ ہمارے ہاں ایک فقہی اصطلاح کے طور پر آتا ہے۔ فقہی تقسیم اس طرح ہے کہ تعبدی اُمور میں فلاں کام فرائض ہیں، فلاں سنن ہیں، فلاں کام نوافل اور فلاں کام مستحبات ہیں۔ پھر سنن کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہ غیر مؤکدہ۔ اسی طرح چند معاشرتی و تمدنی آداب کو سنت قرار دیا جاتا ہے اور جب بھی لفظ سنت بولا جاتا ہے تو یہی تصور سامنے آجاتا ہے۔ میں نے جتنا غور کیا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہی تمام غلط تصورات کی اصل ہے۔ قانون اور فقہ میں کوئی ایک چیز فرض، اس سے کم درجے میں سنت، اس سے کم تر درجے میں نفل، یہ بالکل دوسری تقسیم ہے۔ اس قسم کی جب جزوی سنتوں کا ذکر ہوتا ہے تو احادیث کا اندازِ بیان عموماً یہ ہوتا ہے کہ اُسے "مِنْ سُنَّتِیْ" کہا جاتا ہے۔ جیسے "اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ" اور اَلسِّوَاکُ

وَالتَّعَطُّرُ مِنْ سُنَنِ الْاَنْبِيَاءِ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) "مسواک کرنا اور عطر لگانا تمام انبیاء (علیہم السلام) کی سنتوں میں سے ہے۔

جب "سنّت" ایک اصطلاحِ دینی اور وحدت اور مجموعی اعتبار سے بولا جائے گا تو اس کا مفہوم ہوگا "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ"۔ آپؐ کا طرزِ عمل بحیثیت مجموعی زندگی کے معمولات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ توازن — وہ نسبت وتناسب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولاتِ زندگی کے اجزاء کے مابین برقرار رکھا۔

نبی اکرمؐ کی سنت جلیلہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آغازِ وحی سے الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت تک کی حیاتِ طیبہ کُل کی کُل کو بحیثیت مجموعی (AS A WHOLE) لیجیے، تو یہ ہے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام — اجزا کا معاملہ، اُن کی اہمیت، ان پر اجر و ثواب اپنی جگہ ہے۔ کون مسلمان ہوگا جو اس سے انکار کی جرأت کر سکے۔ جس چیز کے متعلق بھی معلوم ہو جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا، اس کو اختیار کرنا یقیناً بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہوگا۔ لیکن یہ سو شہیدوں کے مساوی ثواب کی جو بشارت دی گئی ہے، اس کو ذہن میں رکھئے کہ ان جزوی باتوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بشارت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے طریقے کو زندہ کرنے سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے فرض بھی سنت کا جزو بن جائے گا۔ فرض ویسے سنت سے بالاتر ہے۔ لیکن جب آپ اس پہلو سے دیکھیں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا طریقہ بحیثیت مجموعی کیا ہے! تو اس میں فرائض بھی شامل ہیں۔ اس میں نوافل بھی ہیں۔ اس میں آپؐ کے معمولات بھی ہیں۔ شب و روز کے انداز بھی ہیں۔ جلوت بھی ہے، خلوت بھی ہے۔ آپؐ کے شمائل بھی ہیں۔ یہ سب مل کر جب ایک وحدت بنیں گے تو اس کا نام ہوگا "سنتِ رسول" علیٰ صاحبہا

لہ "نکاح میری سنت میں سے ہے"۔

الصلوٰۃ والسلام ۔ اس میں فرائض بھی آ گئے اور نوافل بھی آ گئے ۔ سب کچھ آ گیا ۔ یہ ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ۔ اسی کا دوسرا نام ہے اُسوہ یعنی نمونہ : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (اے مسلمانو !) رسولؐ کی پوری زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ زندگی ہے ۔"

اس ضمن میں یہ بات میں نے متعدد بار عرض کی ہے کہ اس سنت کو آپ ہمیشہ دو حصوں میں منقسم سمجھئے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا طریقہ کیا ہے ! یہاں مجھے لفظ طریق پر بے اختیار علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ؎

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے ـــــ خودی نہ بیچ فقیری میں نام پیدا کر

اس پہلے طریقے کا سب سے پہلا اور اہم جزو ہے 'عبدیت' ـــ یہ عبدیت آپؐ کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے ۔ زندگی کے ہر مسئلے پر سب سے غالب عنصر عبدیت کا ہے ـــ آپؐ فرماتے ہیں کہ میں کھانا غلاموں کی طرح بیٹھ کر کھاتا ہوں ۔ آپؐ کی پوری حیات طیبہ پر اولین اور نمایاں ترین چھاپ اسی عبدیت کی چھاپ ہے ۔ آپؐ عبدیتِ کاملہ کے مظہر اتم ہیں ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس عبدیت کے بارے میں کسی تقریر میں میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدیت اس برف کے تودے کے مانند ہے کہ جس کا بہت بڑا حصہ پانی میں چھپا ہوتا ہے ۔ تھوڑا حصہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے ۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں ۔ عبد اللہ ۔ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہوتا تھا ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ وہ بات ہی کچھ اور تھی ۔ اس کی وہ کیفیات بھی ہیں کہ : اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّيْ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۔ " میں اپنے رب کے پاس رات بسر کرتا ہوں ، وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے " یہ کہاں ہمارے فہم میں اور ہماری سمجھ میں آئے گا ! ایک عظیم ماثور دُعا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے اپنی عبدیت کا اظہار فرماتے ہیں ۔ پھر قرآنِ مجید کا " شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ " کا جو پہلو اور وصف ہے اس کے لیے

دُعا فرماتے ہیں۔ بڑی عظیم اور مہتم بالشان دُعا ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ فِیْ قَبْضَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُکْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ: اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اِسْمٍ هُوَلَكَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْعَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِكَ اَوِاسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ وَغَمِّیْ (اٰمین یَارَبَّ الْعٰلَمِیْن) "اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرے ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔ مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اس اسم پاک کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا۔ یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا۔ یا اُسے اپنے مخصوص خزانے یا غیب ہی میں محفوظ رکھا۔ کہ تو بنادے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار ۔ اور میرے سینے کا نُور ۔ اور میرے رنج و حزن کی جلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب"۔ (ایسا ہی ہو اے تمام جہانوں کے پروردگار)

اس طریق اور سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو دوسرا جزوِ اعظم ہے۔ وہ کُل کا کُل ظاہر ہے۔ نمایاں ہے اور آنکھوں کے سامنے بالکل عیاں ہے۔ وہ ہے:

"سنتِ دعوت، سنتِ تبلیغ، سنتِ انذار، سنتِ تبشیر، سنتِ شہادت علی الناس، سنتِ اظہارِ دینِ الحق علی الدین کلّہٖ، سنتِ تکبیرِ ربّ، سنتِ اعلائے کلمۃ اللہ، سنتِ ہجرت اور سنتِ جہاد وقتال۔

عظیم ترین اور متواتر سنت

اجرائے وحی اور یوم بعثت سے لے کر اس حیات دنیوی کے آخری سانس تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی سنت اور اسی طریق کے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس سے بڑی کسی سنت کا تصور ممکن نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کا نمایاں ترین پہلو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھ لیجیے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ دعوت ہے۔ تبلیغ ہے۔ تلقین ہے۔ حق کی طرف بلانا ہے امر بالمعروف ہے نہی عن المنکر ہے۔ دینِ حق کو سربلند کرنے کی سعی و جہد ہے۔ اس کے لیے استہزاء انگیز کیا جا رہا ہے۔ پتھروں کی بارش جھیلی جا رہی ہے۔ معاشی و معاشرتی مقاطعہ برداشت کیا جا رہا ہے۔ اسی کے لیے مجاہدہ ہے۔ کشمکش ہے۔ تصادم ہے اور اسی کے لیے گھر بار کو چھوڑا جا رہا ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ایک جماعت کو منظم کیا جا رہا ہے۔ اور جماعت سے وابستگان کا تزکیہ نفس ہو رہا ہے۔ اسی کے لیے جہاد مع النفس اور قتال بالسیف ہے اسی کے لیے نظروں کے سامنے عزیز ترین جاں نثاروں کے تڑپتے ہوئے لاشے اور مثلہ شدہ نعشیں ہیں ——— یہ تمام دوسری سنت کے اجزاء ہیں۔ اب دونوں یعنی سنتِ عبدیت اور سنتِ دعوت کو جمع کیجیے تو سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ایک وحدت کی حیثیت سے سامنے آئے گی۔

ان سنتوں میں سے اب اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز والی سنت تو لے لے دعوت و تبلیغ والی سنت کو ساقط کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کا تصور سنت بہت ناقص ہے۔ اور وہ معاملہ ہو جائے جو آج ہو رہا ہے کہ نمازوں میں بھی چھوٹی چھوٹی سنتوں پر ہی ساری گفتگو ہے۔ رفع یدین پر ہے اور آمین بالجہر پر ہے تو معلوم ہوا کہ اب تو بات بہت دُور چلی گئی۔ اگر یہ ہو اس پورے نقشے کے اندر سنتِ عبدیت اور سنتِ دعوت کو پوری طرح قائم کر کے ان تفصیلات میں بھی آئیے تو کیا کہنے! نورٌ علیٰ نور والی کیفیت ہو گی۔ لیکن اس کے بغیر یہ بے بنیاد، بے وزن اور بے اصل ہیں۔ اُس سنت کا احیاء مطلوب ہے ——

جو عبارت ہے آپؐ کی پوری زندگی سے ـــــ مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ شغف ہے۔ تہنیت کے قابل ہیں وہ لوگ۔ لیکن سنت کا یہ تصوّر اور اس تصوّرِ سنت کا احیا بایں معنی کہ سنّت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے طریق کا نام ہے جس میں عبدیّت بھی ہے اور دعوت بھی ـــ یہ ہو تو یقیناً لَہٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ " اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر و ثواب ہے " اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ دانتوں پسینہ آتا ہے۔ لیکن مسواک کر کے یہ سمجھ لیا گیا کہ سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہو گیا، کیا کہنے ہیں! اس سے زیادہ سہل الحصول ـــــ (MAKE EASY) معاملہ تو ہے ہی کوئی نہیں۔ وہ شہادت یعنی راہِ حق میں نقدِ جاں کا نذرانہ پیش کرنا بیچاری تو بالکل ہی بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ گئی۔ ہمارے تصوراتِ دین اور تصوّراتِ سنت میں جو عدم مناسبت اور عدم توازن نظر آرہا ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے جُزو کو کُل بنا دیا اور کل کو جزو بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاملہ پلٹ ہو گیا اور اقدار کی عمارت (VALUE STRUCTURE) بالکل مسمار ہو کر رہ گئی۔ لہٰذا اس کو ذہن میں رکھیے کہ صحیح اور حقیقی تصوّرِ سنّت محیط ہے سنتِ عبدیت اور سنّتِ دعوت پر۔ ٹھیک کہا علاّمہ اقبال نے کہ ؏ 'بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست'۔ ہمارے دین کی صحیح تعبیر یہی ہے کہ دین نام ہے اتباعِ رسول کا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ـــ پہنچاؤ اپنے آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر اور اس کا راستہ ہے، واحد راستہ۔ آپؐ کی سنت کی پیروی۔ آپؐ کے طریق پر عمل۔ آپؐ کا کامل اتباع۔ اگر یہ نہیں ہے تو بقول علامہ اقبال ؏ " اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است "۔ اگر سنت رسولؐ تک رسائی نہیں ہوئی، اگر وہاں تک نہیں پہنچے تو یہ بات صد فی صد درست ہے کہ پھر تمام بولہبی ہے۔ میرے نزدیک یہ ہے صحیح تصوّرِ سنّت۔ یہ ہے مقامِ سنت اور موجودہ دور میں اتباعِ رسول اور

احیائے سنت کا تقاضا۔ سنتِ عبدیت اور سنتِ دعوت کا اس کے تمام مراحل کے ساتھ اتباع۔

ہمارے ملک کی بقا اور استحکام کا مسئلہ

اب آیئے دوسرے موضوع کی طرف۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ترکی ان چاروں ممالک کے مسلمانوں کے مذہبی تصورات میں قدیم ہی سے تصوّف اس طرح رچا بسا اور گھلا ہوا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے علیحدہ ہو کر بات کرنا انتہائی مشکل ہے اور اگر آپ بات کریں بھی تو لوگوں کے ذہن اُسے قبول ہی نہیں کریں گے۔ وہ سانچے ہی موجود ہی نہیں ہیں جو بات کو قبول کر سکیں۔ تو وہ (SQUARE PEG IN A ROUND HOLE) والا معاملہ ہوگا۔ بات ذہن میں اُترے ہی گی نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس موضوع سے متعلق اصل بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

افراط و تفریط

میں نے آج آپ کو جو دوسری حدیث سُنائی ہے اس کے راوی ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی 'صحیح بخاری' میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ایک تصور ایسا آرہا ہے جس سے بعض ان باتوں کا اثبات ہوگا جو صوفیاء کے حلقے کی ہیں۔ ہمارے ہاں اس معاملے میں بڑی افراط و تفریط ہے۔ یا تو وہ لوگ ہیں جو ان باتوں کو سرے سے غلط اور سرتاسر باطل سمجھتے ہیں۔ اس کے کسی جزو کو بھی صحیح نہیں خیال کرتے۔ تو اس معاملے کا ایک رُخ یہ ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ ساری گفتگو کراماتِ اولیاء ہی کی ہو رہی ہے۔ آگے پیچھے دوسری کوئی بات ہی نہیں۔ سارا معاملہ بزرگانِ دین کا ہے اور بزرگانِ دین کا سارا معاملہ کرامات، خرقِ عادت پر موقوف نظر آتا ہے۔ اس حلقے کے کل دینی تصورات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ بس یہی چیزیں ان کا دین بن کر رہ گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں بھی جو نقطۂ اعتدال ہے اس کو اس حدیث شریف کے حوالے سے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ پہلے اس حدیث کے بارے

میں چند اہم امور جان لیجیے۔ وہ یہ کہ یہ حدیث قدسی ہے۔ یعنی یہ فرمانِ الٰہی ہے جس کو نقل فرما رہے ہیں خود جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ سے پھر حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں۔ سند کے اعتبار سے اس کا جو درجہ ہے، اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اپنی 'صحیح' میں روایت کیا ہے۔ جس کے متعلق علمائے اُمت کا اجماع ہے کہ اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ: صحیح بخاری۔

ولایت کا حقیقی مفہوم

زیرِ گفتگو حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بات فرمائی: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ۔ "بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے میری ولی (دوست) سے دشمنی کی تو اس کے لیے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔" یہاں لفظ "ولی" قابلِ غور ہے۔ معلوم ہُوا کہ کچھ لوگ اللہ کی ولی (دوست) ہوتے ہیں۔ یہی بات قرآن مجید سے بھی ثابت ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (یونس ۶۲) "آگاہ رہو۔ بلاشبہ جو اللہ کے ولی (دوست) ہیں۔ ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔" پھر ولایت یک طرفہ نہیں بلکہ اس کا معاملہ دوطرفہ ہے: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ○ (البقرہ ۲۵۷) "اللہ اُن لوگوں کا ولی (دوست) ہے جو ایمان لائے ہیں، اللہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے۔" اب یہ بات قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں سے ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا ولی ہے اور اہلِ ایمان اللہ کے ولی ہیں۔ گویا ولایت کا دوطرفہ معاملہ ہے۔

اب اصل میں اس لفظ 'ولی' کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کا بھی ہم نے اپنے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ قائم کر رکھا ہے۔ عربی بڑی وسیع المعانی زبان ہے۔ اس میں قریب المعانی بہت سے الفاظ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک کے معنی اور مفہوم میں ایک لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ اُردو میں یہ

بات نہیں ہے۔ عربی میں دوست کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں، ان میں سے ہر ایک کے مفہوم میں فرق ہے۔ جیسے صدیق۔ اس کے معنی میں سچی اور بے تکلفی کی دوستی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اور جیسے رفیق۔ اس کے معنی میں باہمی دمسازی و ہمدردی کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ یہ رفق سے بنا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرنے والے ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

خُلّت: اسی دوستی کے لیے ایک لفظ ہے خلیل۔ یہ لفظ خلّت سے بنا ہے، اس کے معنی میں انتہائی غالب محبت کی دوستی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا۝ (النساء ۱۲۵) اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔" یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امتیازی شان ہے۔ شاید بعض حضرات کے علم میں وہ حدیث نہ ہو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا "اگر میں کسی کو خلیل بنانا تو ابو بکرؓ کو بناتا۔" معلوم ہوا کہ اس پوری دنیا میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیل کوئی نہیں ہے۔ اگر ابو بکر صدیقؓ بھی خلیل نہیں ہوئے تو اور کون ہوگا؟ پس آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے خلّت کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے رکھا۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ رفیع کے اعتبار سے شرک فی الخلّت کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ اب آیئے سمجھیں کہ ولی کے معنی کیا ہیں؟

ولی کے معنی

ولی بھی عربی کا بڑا وسیع المعانی و مفہوم لفظ ہے۔ اس میں پشت پناہ۔ حمایتی۔ مددگار اور دوست کے مفاہیم شامل ہیں۔ ان سب کو ذہن میں رکھیئے۔ اب اس حدیث کے مضمون کو سمجھیے۔ اس حدیث کے مطالعے سے پہلی اور نمایاں بات یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ ایک ہے تکلیف میں نہ دیکھ سکنا۔ ایک ہے اس کی ذلت اور رسوائی

کو برداشت نہ کرنا جس کو ہم غیرت وحمیت کہتے ہیں۔ اب اگر کسی بندۂ مومن میں اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے غیرت و حمیت ہے تو نسبتِ ولایت ہے ورنہ نہیں ہے ۔ اب یہاں سمجھئے کہ اللہ کے ولی کون ہیں ؟ اللہ کے ولی وہ ہیں جو اس کے دین کے لیے غیرت وحمیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے لیے تو کوئی مدد نہیں چاہیئے۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ ۔ اللہ کو اپنی ذاتی حیثیت سے تو کوئی پشت پناہ درکار نہیں۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ اور سُبْحَانَ اللّٰہِ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔ اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے کہ اُسے اپنی ذات کے لیے حمایتی اور پشتیبان کی ضرورت ہو۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اور وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا۔ اللہ کو جو حمایتی مطلوب ہے۔ اللہ کو جو پشت پناہ مطلوب ہے۔ اللہ کو جو غیرت درکار ہے۔ اللہ کو جس حمیّت کی ضرورت ہے۔ وہ ہے اس کے دین کی ۔۔۔ اپنے دین کے لیے وہ قرض بھی مانگتا ہے: اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ (التغابن ۱۷) "اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمھیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمھارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا، اللہ بڑا قدر دان اور بُردبار ہے۔" اپنے دین کے لیے وہ مدد کی پکار بھی لگاتا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو" (الصف) ۔ کیا معنی! اللہ کے دین کے لیے پیسہ خرچ کرو تو یہ اللہ کو قرضہ حسنہ دینا ہے۔ اللہ کے دین کے قیام و اظہار کے لیے جدوجہد کرو تو یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد شمار ہو گی ۔۔۔ اللہ کے دین کی غیرت وحمیت ہے تو یہ اللہ کی ولایت ہے ۔۔۔ یہ ہے اصل معاملہ ۔۔۔ یہ ہے حقیقی ولایت ۔۔۔ وہ ولایت نہیں ہے کہ دین سرنگوں ہو، ہوا کرے ۔ حدود اللہ پامال ہوں، ہوتی رہیں۔ شعائرِ دین کا مذاق اُڑ رہا ہو، اُڑتا رہے ۔ اپنے بیوی بچے کر رہے ہوں، کوئی پرواہ نہیں۔ وہ اپنے تہجد میں، اپنے نوافل میں، اپنی تسبیحوں میں اور اپنے مراقبوں اور چلّوں میں مگن ہے ۔۔۔ یہ ولایت نہیں، یہ عبادت گزاری نہیں بلکہ ان سے

انحراف، بے راہ روی بلکہ معاندانہ طرزِ عمل (PERVERSION) ہے۔ یہ اس کو منہ چڑانے والی بات ہے ۔ یہ نسبتِ ولایت نہیں ہے، یہ منہ پر دے ماری جانے والی چیز ہے۔

حمیت و غیرت دین اور ولایت لازم و ملزوم ہیں

یہاں وہ حدیث سامنے رکھیے جو ایک مومن صادق کے جسم و جان پر لرزہ طاری کر دیتی ہے اور قلبِ حساس کانپ کانپ جاتا ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا: قَالَ فَقَالَ: "یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ"۔ قَالَ فَقَالَ: "اَقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ!" (رواہ امام بیہقی فی شعب الایمان)۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو!" حضورؐ نے فرمایا کہ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: "اے میرے رب! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشم زدن کی مدت تک بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی!" آنحضورؐ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اُلٹ ڈالو انہیں پہلے اس پر پھر دوسروں پر، اس لیے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے متغیر نہیں ہوئی"۔ غور کیجیے کہ اس بندہ عابد کی عبادت گزاری کی شہادت کون دے رہے ہیں! اور کیا دے رہے ہیں؟۔ گواہی دے رہے ہیں - حضرت جبرئیلؑ امین کوئی گرا ئے کا وکیل نہیں۔ وہاں دے رہے ہیں جہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکے گا - یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ اور گواہی یہ دی جا رہی ہے کہ اس بندہ عابد نے آنکھ جھپکنے کی دیر تک کی مدت بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت میں بسر نہیں کی - لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ -- یہاں کوئی مبالغہ نہیں

ہے۔ ایک شخص کی ذاتی عبادت اور نیکی کا یہ عالم ہے۔ لیکن بارگاہِ خداوندی سے حکم یہ صادر ہوا کہ اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ۔ "الٹو پہلے اس پر پھر دوسروں پر۔" کیوں؟ اس لیے کہ فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِي سَاعَةٍ قَطُّ: "اس کے چہرے کا رنگ میری غیرت و حمیّت کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔" بے غیرت اور بے حمیت انسان۔ یہ اسی سزا کا مستحق ہے کہ میرے عذاب پہلے اس پر نازل ہو، پھر دوسروں پر۔"

حمیّت دین نہیں تو ولایت بھی نہیں

میں نے لفظ ولایت کے مفاہیم میں اس بات کو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ اس کا اصل موضوع ہے حمیت وغیرت۔ یہ دراصل ایمان باللہ کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس حمیت وغیرت حق کے بغیر نہ ولایت کی کوئی ادنیٰ سی نسبت ہے نہ کوئی انفرادی عبادت، کوئی زہد اور کوئی ریاضت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے۔ تواصی بالحق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی وجہد اسی غیرت حق اور حمیّت دینی کے عملی مظاہر ہیں۔ یہ دین کی پشت پناہی اور نصرت ہے۔ ان چیزوں سے اگر زندگی خالی ہے اور انفرادی زہد و عبادت اور وظائف و اوراد ہیں تو ولایت کی نسبت کا کوئی سوال نہیں ہاں تمام ریاضتوں کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پرکاہ کے برابر بھی نہ وقعت ہے اور نہ وزن ہے۔ کسی کی والدہ کی شان میں کوئی شخص کوئی گستاخانہ بات کہہ بیٹھے تو پورے جسم کا خون چہرے پر جمع ہو جائے گا۔ مرنے مارنے پر تُل جائے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی شان میں گستاخی ہوتی رہے۔ اس کے دین کا مذاق اُڑتا رہے۔ لیکن کوئی اپنی نفلی عبادت و ریاضت میں مگن ہے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

اس کے ذہن میں نیکی کے اعلیٰ مراتب حاصل کرنے اور مقامِ ولایت تک رسائی حاصل کرنے کا یہی تصور رہے۔ حالانکہ ولایت کا ہرگز یہ تصور نہیں ہے۔

اولیاء اللہ سے عداوت رکھنے پر سخت وعید

ولی کا حقیقی مفہوم ہے غیرتِ حق، حمیتِ دینی، دین کی پشت پناہی، اس کی نصرت، اس کی اقامت کے لیے جہاد و قتال۔ اگر ولی کا یہ تصور آپ نے جان لیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ: مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ "جس نے میرے ولی کو للکارا، جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی، جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس ولی سے جو ہمہ تن میرے دین کا حمایتی بنا ہوا ہو، اُسے میں چھوڑ دوں!" کیسے ممکن ہے! جو اللہ کا ولی ہے اللہ بھی تو اس کا ولی ہے۔ پس جس نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی رکھی تو اس کے خلاف میں اعلانِ جنگ کر چکا ہوں۔ یہاں قَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ فرمایا گیا۔ عربی میں فعل ماضی پر جب قَدْ لگتا ہے تو (PRESENT PERFECT TENSE) کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کام کا ہو چکنا مراد ہوتا ہے ــــ البتہ اللہ تعالیٰ کی جنگ ہماری آپس کی جنگ کی طرح نہیں ہوتی۔ اللہ تلوار لے کر نہیں آتا۔

اللہ کی تدابیر

اللہ کی جنگ کے لیے مختلف کیفیات ہوتی ہیں ــــ اللہ کا بھی ایک کید ہے۔ ایک مکر ہے۔ اللہ بھی چال چلتا ہے اور خفیہ تدبیر کرتا ہے: اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۞ "یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں" (الطارق ۱۵-۱۶) اور: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (آل عمران ۵۴) "اور وہ (بنی اسرائیل) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے"۔ ــــ اللہ کی چالوں میں سے ایک بہت بڑی چال ہے "امہال و تمہیل"۔ "فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۞" "(اے نبیؐ!) پس ڈھیل دیجئے کافروں کو۔ ڈھیل ان کے لیے ایک مدت تک"۔ ــــ اللہ تعالیٰ کافروں کی رسی دراز کرتا ہے تاکہ وہ ذرا اور جری ہو جائیں۔ اپنا خبثِ باطن پوری طرح ظاہر کر لیں ــــ پھر پکڑیں

گے ـــ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥ ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو گی" اس استدراج کے تصور سے مومنین صادقین ہر دور میں لرزاں و ترساں رہے ہیں ـــ

ڈھیل ہے چھوٹ نہیں

ایک شخص غلط راستے پر جا رہا ہے اور لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہا ہے۔ ایک ہجوم اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ زندہ باد کے نعرے ہیں۔ پھولوں کی بارش ہے۔ ہاتھ اور پاؤں چومے جا رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ استدراج ہے۔ اللہ ڈور ڈھیلی کر رہا ہے۔ کانٹا حلق میں پھنسا ہوا ہے۔ جا کہیں نہیں سکتا۔ ڈور ڈھیلی ہو رہی ہے۔ یہ مہلت ہے: وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ ٥ "میں اُن کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ میری چال بڑی زبردست ہے۔ بہت مضبوط اور پختہ ہے۔ اس میں کسی ضعف کا کوئی سوال نہیں ہے۔" میری ڈور تڑا کر کوئی مچھلی جا نہیں سکتی۔ لہٰذا مجھے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ کر لیں انھیں جو کچھ کرنا ہے ـــ بہرحال یہ ایک دینی اور علمی نکتہ ہے۔ میں نے قدرے اس کی وضاحت کر دی ہے ـــ گفتگو یہ چل رہی تھی کہ ولایت حق ہے۔ یہ ایک نسبت ہے بندے اور رب کے درمیان۔ اور جس نے بھی اللہ کے ولی سے دشمنی رکھی اس کے خلاف اللہ تعالیٰ اعلان جنگ فرما چکا۔ ولایت کی نسبت کیا ہے؟ اس کو بھی میں بیان کر چکا۔ وہ ہے غیرت و حمیت دین کی۔ نصرت و پشت پناہی دین کی۔

اتباعِ سنّت اور ولایت

معلوم ہُوا کہ سنت کا اور ولایت کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہ دونوں قریب آ گئے۔ کسی شہر کے بہت سے دروازے ہوں تو جس دروازے سے بھی داخل ہوں گے۔ اُسی شہر میں داخل ہوں گے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا تقرب حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ یہاں ایک ضمنی لیکن اہم بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے اور حاصل کیا جانا چاہیئے ۔ دو نتیجے نکل آئے ۔ یہ کوئی نظریاتی وخیالی (THEORATICAL) بات نہیں ہے ۔ پوری شریعت، پوری طریقت اور کل سلوک کا لُبّ لباب کسی ایک جملے میں کہیں گے تو وہ تقرب الی اللہ ہے ۔ نماز پڑھو اور سجدہ کرو۔ سجدے میں اللہ سے اور قریب ہو جاؤ۔ تقرب مقصود ہے ۔ شریعت کے معنیٰ چلنا۔ طریقت کے معنیٰ، چلنا اور سلوک کے معنی، چلنا۔ تینوں الفاظ کے مفاہیم میں ایک باریک سا فرق ہے ۔ لیکن تینوں میں چلنا مشترک ہے ۔ چلنا کس لیے ہوتا ہے؟ کسی منزل سے قریب ہونے کے لیے۔ !منزل کیا ہے؟ وہ ہے قرب الٰہی ۔ اب دوسرے الفاظ دیکھیئے ۔ صراط ۔ صراطِ مستقیم ۔ صراط السبیل ۔ سواد السبیل ۔ قصد السبیل ۔ ان سب الفاظ میں راستے کا مفہوم مشترک ہے ۔ راستے کا مقصود کیا ہوتا ہے؟ کسی منزل تک پہنچانا۔ منزل کیا ہے؟ اللہ کا تقرب ۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (النحل ۹۰) "اور اللہ کے ذمے ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ ٹیڑھے راستے بھی بہت سے موجود ہیں۔" قصد السبیل وہ سیدھا راستہ جو عین اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاتا ہے ۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ یہ سڑک وہاں جا کر ختم ہوتی ہے ۔ ٹیڑھے راستے آپ کو اِدھر اُدھر بھٹکا دیں گے ۔ اس حدیث میں جو بہت ہی قیمتی حدیث ہے ۔ بہت ہی اہم حدیث ہے ۔ تقرب الی اللہ کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔

تقرب کے مدارج اور مراتب

ایک تقرب بالفرائض ۔ دوسرا تقرب بالنوافل۔ ان دونوں میں نسبت بڑی عجیب (پیاری) ہے ۔ تقرب بالفرائض اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسند ہے :

وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ۔ "جو چیزیں میں نے اپنے بندے پر فرض کی ہیں ان کو بجالا کر بندہ جب میرا تقرب حاصل کرتا ہے تو اُس سے زیادہ محبوب اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔" یہ ہے تقرب بالفرائض ــــ اب دوسرے ذریعے کو سمجھئے وہ کیا ہے؟ وہ ہے تقرب بالنوافل۔ دیکھئے یہاں لفظ سنت نہیں ہے۔ یہاں فرض کے بعد فوراً نفل آگیا۔ یہ ایک اور انداز سے ترتیب ہے۔ ایک وہ چیز ہے جو اللہ نے عاید کر دی ہے، لازم کر دی ہے، فرض کر دی ہے۔ اس پر آگے بحث ہوگی کہ وہ فرض کیا کیا ہیں؟ ایک اس سے آگے کا مرحلہ ہے جو ایک بندہ مومن اپنی آزاد مرضی سے کرتا ہے۔ وہ نفل ہے۔ یہ دین کے ہر میدان اور ہر شعبے میں ہے۔ نماز فرض ہے۔ نماز نفل بھی ہے۔ صدقاتِ واجبہ ہیں، زکوٰۃ ہے، عشر ہے۔ صدقاتِ نافلہ بھی ہیں جو زکوٰۃ کے علاوہ کئے جانے چاہئیں۔ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ باقی نفلی روزے جو جتنے چاہے رکھے۔ صاحبِ استطاعت پر ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ باقی جتنے چاہے کرے وہ نفل ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک درجہ وہ ہے جس کا بجالانا لازم ہے۔ اس پر ایک اضافی اور بالاتر درجہ ہے وہ نفل ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں۔ اس میں جو جتنا چاہے۔ آگے بڑھے۔ سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا پہلے فرمایا: وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ "میں نے اپنے بندے پر جو چیزیں فرض کی ہیں، ان کو بجالا کر مجھ سے جو تقرب حاصل کرتا ہے تو یہ عمل مجھے محبوب ترین ہے۔" لیکن اور یہ بہت بڑا لیکن ہے (A VERY BIG BUT) پھر فرمایا: وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ۔ "اور میرا بندہ اگر نوافل کے ذریعے میرا تقرب تلاش کرتا رہے، چاہتا رہے، کوشاں رہے۔ اس میں پیہم جدّوجہد کرے۔ بڑھتا چلا جائے۔ لَا یَزَال۔ تو اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ "حَتّٰی اُحِبَّہٗ"۔ "یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں"۔ عجیب

اور بڑا پیارا انداز ہے ۔ شخصاً محبوب وہ ہے جو تقرب بالنوافل کی منزلیں طے کر رہا ہے ۔ طریقے کے اعتبار سے محبوب تقرب بالفرائض ہے ـــــ اچھا اب دیکھیے کہ محبوبیتِ خداوندی کے لیے جو الفاظ آئے ہیں ـــ اگر کوئی انسان ان الفاظ کو بولتا تو وہ کفر بھی قرار پاتا اور شرک بھی قرار پاتا ۔ اس میں تو عینیت ہو جاتی ۔ اس میں اللہ اور بندے کی تقسیم ختم ہو جاتی اور نہ معلوم کتنی پیچیدگیاں اور دشواریاں اس میں پیش آتیں اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا ۔ لیکن غور کیجیے یہ کلام کس کا ہے ؟ـــ اللہ تعالیٰ کا ۔ حدیث قدسی ہے ۔ نقل کون فرما رہے ہیں ـــ ؟ الصادق المصدوق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ " جب میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں تو میں اُس کی سماعت بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے : فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ ؕ " اور میں اُس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے : وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ " اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے : وَيَدَهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا ـــ " اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔ : وَرِجْلَهُ الَّتِىْ يَمْشِىْ بِهَا ـــــ "
اللہ اکبر ! ہم کہہ سکتے ہیں یہ الفاظ ! ! اللہ بندے کا ہاتھ بن جائے ! چلیے کان ۔ آنکھ اور ہاتھ تک شاید کچھ معاملہ بن جائے ـــ لیکن اللہ کسی کا پاؤں بن جائے اللہ اکبر و اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر کبیراً ۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ حدیث قدسی ہے اور صحیح بخاری کی روایت ہے ۔ انشاء اللہ آگے جب میں اس حدیث کی مزید شرح کروں گا تو توقع ہے کہ بات واضح ہو جائے گی ـــ حدیث شریف میں آگے فرمایا : وَلَئِنْ سَاَلَنِىْ لَاُعْطِيَنَّهٗ ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِىْ لَاُعِيْذَنَّهٗ ۔ " اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں لازماً اس کا سوال پورا کروں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے گا تو کیسے ممکن ہے کہ میں اُسے پناہ نہ دوں، میں لازماً اُسے پناہ دوں گا ۔"

کرامت اولیاء اس حدیث شریف کے مطالب و مفاہیم سے جو ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے اب اُسے جان لیجئے: کرامت اولیاء کے لیے یہ حدیث سند ہے، نص ہے۔ اللہ جس بندے کے پاؤں بن جائے، اس کی رفتار کو آپ اپنی (SPEED) سے ناپیں گے کہ وہ برق سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے کیسے چلا! بڑی حماقت ہے۔ پاگل پن ہے۔ اسی طرح جس کی آنکھ اللہ بن جائے، اس کے بارے میں یہ سوچا جائے کہ یہ کیسے دیکھ لیا! عمر فاروقؓ نے مدینہ میں مسجد نبوی کے ممبر پر بیٹھے کیسے شام کا میدانِ جنگ دیکھ لیا۔ یہ "کیسے" کا سوال کسی کے ذہن میں آیا تو یہ حماقت اور پاگل پن ہے۔ اس میں کسی کو اگر استبعاد محسوس ہو تو اس نے موٹی سی بات نہیں سمجھی: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ "مومن کی فراست سے بچو اور ڈرو اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے"۔ یہ ارشاد ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ (X-RAYS) آپ کے جسم میں سے گزر جائیں اور اس کی خفیف ترین چیز کو بھی ظاہر کر دیں تو اللہ کا نور کس کس چیز کو چیر جائے گا! ؎

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے تخیلات میں

یہ کیفیت ہے جو کبھی کبھی طاری ہوتی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِنَّھَا یَا حَنْظَلَۃ سَاعَۃً فَسَاعَۃً: "اے حنظلہ یہ کیفیات مستقلاً نہیں ہوا کرتیں، کبھی کبھی ہوتی ہیں"۔

پس اس حدیث سے اصولاً کراماتِ اولیاء کا اثبات ہوتا ہے۔ جو شخص اس حدیث کو صحیح مانتا ہے اسے اس بات کو بھی ماننا پڑے گا۔ ورنہ اُسے اس حدیث کو صحیح بخاری سے کھرچنا ہوگا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے جیسی کہ فی الواقع ہے تو ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس میں بیان ہوتی ہیں۔

احتیاط کی ضرورت البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان کو ہم امکانی حد تک صحیح تسلیم کریں گے۔ کسی معین واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا

جاسکتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی استدراج ہو رہا ہو۔ اجہال و تہیل ہو رہی ہو۔ کسی فوت شدہ نیک بندے کی رُوح کے بجائے کسی شیطان نے کسی کو بات سُجھا دی ہو۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس سے محفوظ صرف نبی ہوتا ہے۔ باقی کوئی شخص محفوظ نہیں۔ بڑے سے بڑا ولی محفوظ نہیں۔ محفوظیت اور معصومیت صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے۔ لہٰذا بڑے سے بڑے ولی کو بھی کسی وقت شیطان چکمادے سکتا ہے۔ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چکما دینے کی کوشش کی، احادیث میں صحیح واقعات موجود ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایسے چند واقعات سُن کر فرمایا کہ تم نے پہچانا نہیں، یہ شیطان تھا۔ ساتھ ہی آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمادیا کہ "جس نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے واقعی مجھے ہی دیکھا ہے کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا"۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ خواب میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح نے مجھ سے یہ کہا۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہوسکتا کہ کسی شیطان لعین نے کوئی اُلٹی پلٹی پڑھائی ہو اور کہا یہ ہو کہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی رُوح ہوں۔ ان دونوں چیزوں کو پیشِ نظر رکھیے۔ انکار کر دینا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا، ناممکن ہے، محال ہے تو یہ طرزِ فکر اس حدیث کے خلاف ہے۔ اللہ اپنے اولیاء کا کان بنتا ہے، آنکھ بنتا ہے، ہاتھ بنتا ہے، پاؤں بنتا ہے، وہ اس حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن کسی معین واقعے کے بارے میں تعین کے ساتھ حتمیت اور قطعیت اور یقین کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ کسی شخص معیّن پر ایمان لانے کا ہمیں مکلّف نہیں کیا گیا۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری ہستی ہیں، جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ آگے نہ ابوبکر صدیقؓ پر، نہ عمر فاروقؓ پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے، نہ کسی اور صحابی پر۔ رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ جب خلفاء راشدین المہدیین اور صحابہ کرامؓ پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں ہے تو اولیاء اللہ پر ان میں چاہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں، چاہے معین الدین اجمیریؒ ہوں، کسے باشد۔ ان پر ایمان لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو صحابہ کرامؓ کو معصوم نہیں مانتے۔

ان سے بھی خطا ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ خطائے اجتہادی ہوگی۔ اس میں بدنیتی تقاضا نہیں ہوگی۔ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ۔

اعتدال وتوازن کی ضرورت

اس لیے اولیاء اللہ سے بھی غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔ لہٰذا ایک تو یہ توازن پیدا کرنا ہے کہ ان چیزوں کا بالکل انکار کر دینا درحقیقت دین کی ایک اہم اور بہت بڑی حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھوں کا بند کر لینا ہے۔ نقصان آپ کا اپنا ہوگا، کسی اور کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگرچہ تعین کے ساتھ کسی بات کی نہ ہم تصدیق کریں گے، نہ تردید کریں گے اور نہ تکذیب کریں گے۔ وہ جانے اور اس کا ربّ جانے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے۔ ہمارے لیے اصل دلیل اور حجت صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تصوّف کے حلقے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ کسی ولی کا کشف دوسرے کے لیے دلیل وحجت نہیں ہے۔ ہاں اگر صاحب کشف کو یہ اطمینان ہو کہ مجھ پر صحیح بات منکشف ہوئی ہے تو اس کے لیے وہ دلیل و حجت ہو جائے گی۔ آخر انسان کی فطرت بھی تو رہنمائی کرتی ہے۔ ایک گواہی اندر سے بھی تو اس کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر اُسے یقین ہو جائے کہ اس کشف میں شیطنت نہیں ہے بلکہ یہ خدائی الہام ہے اور رحمانی القا ہے تو اس پر وہ حجت ہو جائے گی۔ بشرطیکہ وہ کتاب وسنت کے منافی نہ ہو۔ باقی رہا دوسروں کا معاملہ! تو اگر کسی ولی کا کشف قرآن وسنت کے مطابق بھی ہو تو کسی کے لیے حجت نہیں ہے۔ دین میں حجت کوئی چیز ہے تو وہ صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے۔ جو بات مانی جائے گی وہ اس دلیل اور بنیاد پر مانی جائے گی۔ اُصولی طور پر اس بات کو صوفیاء کے حلقے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کرامت و کشف کا انکار، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

افضل اور اعجب ایمان

البتہ جو بات اس ضمن میں سمجھنی ضروری ہے، اس کو اچھی طرح جان لیجیے۔ اس میں جو نسبت ہے، اس کو میں دو مثالوں سے آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ افضل طریقہ جو ہے

وہ تقرب بالفرائض ہے۔ اگرچہ اعلیٰ طریقہ جو ہے بلند تر منزل جو ہے وہ تقرب بالنوافل ہے۔ اس کی پہلی مثال میں نے پہلے بھی کسی تقریر میں دی تھی۔ ہمارا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ افضل ترین ایمان صحابہ کرامؓ کا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک صحبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ایمان کی گفتگو شروع ہوئی۔ اس صحبت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ "تمھارے نزدیک سب سے زیادہ اعجب (خوبصورت ترین) ایمان کس کا ہے؟ سب سے زیادہ دل آویز اور پیارا ایمان کس کا ہے؟" صحابہ کرامؓ نے خوب غور کر کے عرض کیا کہ "ملائکہ کا ہے!" آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ملائکہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے وہ تو اللہ کے حضور میں ہیں، قریب ہیں۔ اللہ کا وجود ان کے لیے غیب نہیں۔" صحابہؓ نے پھر سوچا اور ترمیم کر کے عرض کیا کہ "انبیاء کا ہے!" آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے۔ انھوں نے ایمان لا کر کون سا کمال کیا ہے ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے، اللہ کے فرشتے ان کے پاس آتے جاتے ہیں اور اللہ کا پیغام لاتے ہیں!" اب صحابہ کرامؓ نے جھجکتے جھجکتے کہا کہ "پھر ہمارا ہے!" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تمھارا کیا ایمان! تم نے مجھے دیکھا ہے، میری صحبت سے فیض یاب ہوئے ہو! میرے نزدیک خوبصورت ترین ایمان دل آویز ترین ایمان ہمارے ان بھائیوں کا ہوگا جو ہمارے بعد آئیں گے۔ اور ان کو کیا چیز ملے گی؟ میں نہیں ہوں گا، میری صحبت نہیں ملے گی۔ انھیں اللہ کی کتاب ملے گی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ میرے نزدیک ان کا ایمان اعجب ہے۔ حسین ترین ہے۔ خوب صورت ترین ہے۔" یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے۔ میں نے اس کی تشریح بیان کی ہے۔ حدیث کا متن بھی سن لیجیے۔

وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ای الخلق اعجب الیکم ایماناً قالوا الملائکۃ قال ما لھم لا یؤمنون وھم عند ربھم قالوا فالنبیون قال وما لھم لا یؤمنون والوحیُ ینزل علیھم قالوا فنحن

قال وما لکم لا تومنون وانا بین اظہرکم قال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انَّ اعجبَ الخلق اِلیَّ ایماناً لقومٌ یکونون من بعدی یجدون صحفاً فیھا کتابٌ یومنون بما فیھا۔

اس حدیث کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ ایمان کے افضل ہونے کے علاوہ اس کا ایک پہلو اعجب ہونا بھی ہے۔ یہ بات تو عام طور پر ہم سب ہی جانتے ہیں کہ افضلیت و فضیلت کے اعتبار سے امت میں سے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی اس صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا، جس نے حالت ایمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ چاہے ایک گھنٹے کے لیے اُٹھائی ہو۔ مشہور محدث، فقیہہ، عابد و زاہد اور مجاہد بالسیف حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ میں سے ان کے نزدیک افضل کون ہے؟ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کا چہرہ اس سوال پر تمتما اُٹھا اور اُنھوں نے فرمایا "خدا کی قسم جس گھوڑے پر بیٹھ کر حضرت معاویہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہاد کیا تھا اس گھوڑے کے منہ سے نکلنے والا جھاگ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل تھا" پھر شخصیت کے تقابل کا کیا سوال! لیکن اس حدیث سے اعجب معلوم ہوا ہے کہ (خوب صورت ترین۔ دل آویز اور حسین ترین) ایمان (حقیقی ایمان) اُن خوش نصیبوں کا ہوگا جو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کے بعد آپؐ کا دورِ سعید اور آپؐ کی صحبت مبارکہ سے محروم ہونے کے باوجود کتاب اللہ پر ایمان لانے کے ذریعے سے آپؐ کی رسالت پر ایمان لائیں گے اور دین کی جملہ باتوں کی تصدیق کریں گے اور ان پر عمل کی کوشش کریں گے۔ اب اس حوالے سے اس معاملے کو سمجھیے۔ افضل جو ہے، وہ تقرب بالفرائض ہے۔ اعجب جو ہے، وہ تقرب بالنوافل ہے۔

اسی بات کو اب دوسری مثال سے سمجھ لیجیے، اس سے بات بہت واضح ہو جائے گی۔ کسی دو منزلہ عمارت کا ذہن میں خیال جمائیے۔ بلند تر منزل کون

سی ہے ! یقیناً دوسری منزل ۔ اہم تر کون سی ہے ! آپ سب کا جواب ہوگا پہلی منزل ۔ پہلی منزل کا تصور تو دوسری منزل کے بغیر ممکن ہے، تعمیر کا سارا دار و مدار پہلی منزل کی تعمیر پر ہے ۔ اگرچہ رہے گی نیچے ۔ بلند تر منزل بہرحال دوسری منزل ہی ہوگی ۔ یہ ہے وہ مقام : وَلَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ، كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ، " اور جب میرا کوئی بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب چاہتا ہے تو میں بھی اس کو محبوب رکھتا ہوں اور جب میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اُس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اُسے لازماً دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کوئی پناہ چاہتا ہے تو اُسے پناہ بھی لازماً دیتا ہوں ۔" یہ ہے بلند تر اور اعلیٰ منزل ـــ اونچی یہی ہے ۔ لیکن پہلی منزل تقرب بالفرائض والی منزل قائم کیے بغیر کوئی دوسری منزل کے سازوسامان کی فراہمی میں ہمہ تن مصروف ہے، اُسی کے لیے دوڑ دھوپ ہے ۔ تو میرے نزدیک یہ ایک فضول اور احمقانہ فعل ہے ۔ پہلی منزل کے بغیر دوسری منزل کی تعمیر ناممکنات میں سے ہے ۔ یہ تو کسی شیخ چلی کے دماغ میں بن سکتی ہے ۔ کسی مخبوط الحواس (FANATIC) کے ذہن میں اس کا تصور آسکتا ہے ! کوئی صحیح الدماغ شخص اس بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا ـــ لہٰذا اوّلیت پہلی ہی منزل کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب ترین یہی منزل ہے : وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ۔ " اور میرا جو بندہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے تو اس سے زیادہ محبوب اور کوئی

ذریعہ نہیں ہے"۔ تصوّف کے بعض مسائل کے سلسلے میں یہ ہے ہمارا تصور۔

اصل ذکر کیا ہے

اب اس میں ایک بات کی مجھے مزید کچھ وضاحت کرنی ہے اس کے بعد میں آگے چلوں گا اور یہ کوشش کروں گا کہ "دینی فرائض" کا ایک واضح وجامع تصور آپ حضرات کے سامنے بیان کر دوں۔ تصوف کے میدان میں اہم ترین بحث ذکر کی ہے۔ ہمارا تصوّر ان کے تصوّر سے مختلف ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے گا کہ ہم ذکر کے قائل ہی نہیں معاذاللہ۔ ہمارے نزدیک ذکر، حقیقی ذکر، مجسم ذکر، مؤثر ترین ذکر قرآن مجید ہے۔ جس کو بھلا دیا گیا، جس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہماری فکری، ذہنی اور عملی کج روی اور بے راہ روی کا اصل سبب یہی ہے کہ ذکر اپنے اصل ہدف سے ہٹ گیا ہے۔ ؏ آہ وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف

میں نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک اصل ذکر قرآن حکیم ہے۔ اس کے بے شمار شواہد قرآن حکیم سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن وقت کی کمی اس کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۂ حجر میں فرمایا: وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ آیت ۶ "اور لوگ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر الذکر (قرآن مجید) نازل کیا گیا ہے تو یقیناً دیوانہ ہے"۔ یہ کفّار مکہ کا قول قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس میں منکرین نے بھی قرآن کو ذکر کہا ہے جس کی توثیق اللہ تعالیٰ اسی سورت میں اس طرح فرماتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (آیت ۹) "بےشک ہم نے اس الذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ سورہ النحل میں فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (آیت ۴۴) "اور ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف یہ الذکر (قرآن مجید) نازل کیا ہے تاکہ آپ اس تعلیم کی جو آپ کی طرف لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے۔ توضیح و

تشریح ان کے سامنے بیان کریں اور شاید لوگ خود بھی غور و فکر کریں ——"
ان آیات ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، الذکر، مجسم ذکر، سر تا سر ذکر ہے قرآن ——اسے پڑھو اسے حرزِ جان بناؤ۔ اسے ذہن میں اُتارو اس کو حفظ کرو۔ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ اس کی تلاوت کرو جیسا کہ تلاوت کا حق ہے اور اس کے ذریعہ اپنے رات اور دن کو زندہ کرو۔ یہ ہے اصل ذکر۔ اس کے بعد نماز کے متعلق فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ "نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے"
نماز کا مقصد ذکر ہے اور سنتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیا ہے؟۔ نفلی ذکر کو بھی آپؐ نے نماز کی شکل میں سمو دیا ہے۔ رات کی عبادت نفلی عبادت ہے۔ لیکن اس نماز کا عالم کیا ہے! طویل قیام ہے اور طویل قرآن کی تلاوت ہے۔ ایک ایک رکعت میں سورۃ البقرہ، سورہ آلِ عمران، سورۃ النساء تین طویل ترین سورتوں کی تلاوت ہے۔

"ذکر" کا عام تصور

یہ طریقے چھوڑ کر ہم نے ضربیں لگانی سیکھیں، خاص اسن ایجاد کیے ہیں۔ نشست کے خاص انداز ہم نے نکالے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے! اس پر عمل کرنے والوں میں جو منصف مزاج لوگ ہیں وہ یہ بات مانتے ہیں کہ یہ طریقے آنحضرتؐ سے منقول و ماثور نہیں ہیں۔ یہ بعد کے چند لوگوں کے اپنے اجتہادی اور تجرباتی معاملات ہیں۔ لیکن میں نے آپ کو بتایا کہ نبی اکرمؐ کی تعلیم کیا تھی! فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ لہٰذا ہمارے لیے اس معاملے بھی سنتِ نبوی اور سنت خلفائے راشدین مہدیین ہی کو اختیار کرنے میں عافیت ہے۔

"سلوک" محمدی

یہ نہ سمجھئے کہ ہم کسی سلوک کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ سلوک محمدیؐ ہے صلی اللہ علیہ وسلم جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سلوک اور سنت کو جمع کیا ہے۔ ہم نے سلوک کے غلط تصورات کو چھوڑا ہے۔ جہاں اُوپر کی منزل تعمیر کرنے کی کوشش ہوتی ہے نچلی منزل کے بغیر۔ جہاں سارا زور ذات پر ہے۔ حمیتِ دین اور غیرت کا معاملہ خارج از بحث ہو گیا ہے۔ ہم نے اس کو ترک

کیا ہے تو علیٰ وجہ البصیرت ترک کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تصوف کی جو مطلوبہ چیزیں اور مقاصد ہیں، ان کو ہم نہ مانتے ہوں اور ان کو نہ سمجھتے ہوں۔ معاذ اللہ۔ تصوف کا اصل موضوع تطہیر قلب اور تعمیر سیرت ہے۔ ہم علیٰ وجہِ البصیرت کہتے ہیں کہ اس کا اصل منبع و سرچشمہ ہے قرآن ـــــ جو شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ بھی ہے۔ هُدًى لِّلنَّاسِ بھی ہے۔ كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ بھی ہے الذکر اور الذکریٰ بھی ہے۔ رَبِيْعُ قَلْب بھی ہے، نُوْرِ صدر بھی ہے۔ جِلَاءُ حُزْن بھی ہے اور ذَهَابُ هَمّ و غم بھی ہے۔ الغرض ہمارے نزدیک تزکیۂ نفس کا اصل ذریعہ ہے قرآن مجید ـــــ اس کا لُبّ لباب ہے ایمان ـــــ اور ایمان کا لب لباب ہے، توکّل اور راضی برضائے ربّ رہنا ـــــ یہی تصوف کا حاصل ہے۔

چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا ｜ بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا

کون اس کا انکار کرے گا۔ معاملہ ذرائع کا ہے۔ ہم نے سلوکِ محمدیؐ کو اختیار کیا ہے۔ جس کا منبع و سرچشمہ قرآن مجید اور وہ اذکار وظائف اور ادعیہ ماثورہ ہیں جو سنّت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام سے ثابت ہیں۔

سیرت کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سلوک کون سا تھا! تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ اس میں اصل اہمیت سلوک بالفرائض کی تھی ـــ جہاں تک آنحضرتؐ کے معاملے میں ہم کیا عرض کریں گے، یہ آپؐ نے خود فرمایا: اَيُّكُمْ مِثْلِيْ اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّيْ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ۔ "تم میں سے کون میرے مانند ہو سکتا ہے۔ میں رات اپنے رب کے پاس بسر کرتا ہوں، وہ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔"

صحابہؓ کا سلوک صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دیکھئے کہ ان کا سلوک کون سا تھا۔ یہ سلوک بالفرائض تھا۔ ان کا سارا زور، ان کی ساری توجہ فرائض پر مرکوز نظر آتی ہے ـــــ میں جب "دینی فرائض" کا ہمہ گیر اور جامع تصور آپ کے سامنے رکھوں گا تو بات اور کھل جائے گی ـــ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بعد کے ادوار میں ان تصورات دینی اور سلوک محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام پر رفتہ رفتہ مختلف حجابات

پڑتے چلے گئے فی الوقت تو یہ دینی تصورات حجابات میں ایسے مستور ہوئے کہ عوام تو عوام خواص کی آنکھوں سے بھی اوجھل ہو گئے اب تو عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دینی فرائض بس نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادات میں محدود و محصور ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بھی چند نمایاں اسباب ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے۔

مقدم و مؤخر کا لحاظ لازم

پہلا اور نمایاں سبب یہ ہے کہ جب "اسلام" بحیثیت دین موجود ہی نہیں تھا۔ موجود ہونا اور نافذ العمل ہونا تو در کنار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین توحید کو خود ان کے جلیل القدر فرزند اور رسول اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل گم کر چکی تھی اور اس پر مشرکانہ عقائد اور نظریات و توہمات کا پورا غلبہ تھا ایسا غلبہ کہ مکہ مکرمہ میں جو گھر خالص اللہ کی عبادت کے لیے ان باپ بیٹوں نے تعمیر کیا تھا بمصداق آیات قرآنی اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ اور وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط (۲-۱۲۷) اور وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (۲-۱۲۵) اور وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ (۱۴-۳۵)

اس بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، جن کی پرستش ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید کئی فرقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ روح اور عمل دونوں اعتبارات سے توحید خالص کا تصور مسخ ہو چکا تھا حتیٰ کہ ان میں ایک ایسا فرقہ بھی موجود تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا تھا: وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰہِ (۹-۳۰) حضرت مسیح علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید یونان و روم کی صنم پرستی سے مغلوب ہو کر تثلیث یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس کے بدترین مشرکانہ عقائد میں مبتلا تھا: وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ (۹ - ۳)۔ مجوسی آتش پرستی اور ثنویت (خدائے خیر اور خدائے شر۔ یزدان اور اہرمن) کے مقر اور قائل تھے۔

الغرض پوری دنیا میں شرک کے اندھیارے چھائے ہوئے تھے۔

اقامتِ دین

اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ دینِ توحید کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے : اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ۔ " دین کو قائم کرو"۔ اس معرکۂ حق وباطل کے لئے خود کو تیار کرنا تھا۔ اس کے لئے اپنے قلب وذہن کو تقرب الی اللہ کے لئے تقرب بالفرائض کے پہلو بہ پہلو تقرب بالنوافل کو بھی معمولات میں شامل کرنا تھا۔ ان دونوں ذرائع سے اپنے فکر ونظر کو نورِ ایمان سے منور اور شوقِ شہادت سے مملو اور معمور کرنا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار ساتھی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہمیں دورِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ تھا صحابۂ کرامؓ کا سلوک۔ اسی کی شہادت قرآن مجید دیتا ہے۔ احادیث شریفہ دیتی ہیں۔ اسی کی گواہی سیر کی تمام مستند کتب دیتی ہیں۔ اسی نقشہ کی علامہ اقبال نے یوں تعبیر کی ہے ؎

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن

چوں پختہ شدی خود را بر سلطنتِ جم زن

البتہ بعد میں جب دین غالب ہوگیا۔ نہ صرف عرب بلکہ عراق، شام، فلسطین، ایران حتیٰ کہ افریقہ کے شمالی علاقے کے بہت بڑے حصہ پر اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند ہوگیا۔ شریعت کا نفاذ عمل میں آگیا۔ اللہ کا حکم چل رہا ہے۔ ——— اسلامی عدالتیں قائم ہیں۔ قاضی ہیں۔ فتاویٰ دیے جارہے ہیں۔ شریعت خداوندی کے مطابق فیصلے ہورہے ہیں۔ لہٰذا اب وہ وقت آیا کہ تقرب بالفرائض کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل کی طرف زیادہ توجہ دی جائے چنانچہ اس دور میں بھی کثرت کے ساتھ ایسے حضرات نظر آتے ہیں جو تقرب بالفرائض یعنی فرضِ اقامتِ دین کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل میں بھی پورا انہماک رکھتے تھے۔ تاریخ کی یہ بڑی عجیب اور بڑی پیاری شہادت ہے کہ جب اللہ کے دینِ توحید کی دعوت وتبلیغ اور نظامِ قسط وعدل کے قیام ونفاذ کے لیے مجاہدینِ اسلام ایران جیسی وقت کی ایک عظیم ترین قوت سے نبرد آزما ہوئے اور اس کی مضبوط اور عظیم عسکری قوت ان مٹھی بھر اور ناقص وناکمل اسلحہ جنگ کے حامل مجاہدین کی ایمان کی آہنی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے لگی تو ایرانی سپہ سالار

رستم نے اپنے جاسوس بھیجے کہ معلوم کریں کہ ان بے سروسامان اور لوٹ مار کی خوگر عرب قوم کی اس کایا پلٹ اور قلبِ ماہیت کے اسباب کیا ہیں ؟ تو اس کے مخبروں اور جاسوسوں نے اپنی تفتیش اور جاسوسی کی رپورٹ جن الفاظ میں دی ، وہ تاریخ میں آج بھی ثبت ہیں ان کی رپورٹ یہ تھی کہ ایرانی قوت کا پالا اس قوم سے پڑا ہے جو "فرسانٌ بالنهار ورُهبانٌ بالليل" ہیں یعنی دن میں یہ لوگ شہسوار اور مردانِ میدانِ کارزار ہیں اور ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام وسجود، گریہ وزاری اور دعا و مناجات میں بسر ہوتی ہیں۔ ان کی ڈاڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیتِ الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں ـــــ حالانکہ دُنیا جنگ کے جن طور طریقوں سے واقف تھی اور آج بھی آگاہ ہے وہ تو یہ رہے ہیں اور آج بھی ہیں کہ فوجیوں کی راتیں شراب وکباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں ـــــ یہ وہ عجوبۂ روزگار انوکھے اور نرالے اللہ کے سپاہی تھے کہ جن کے متعلق دُشمن کے جاسوس یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ فرسان بالنهار ورهبان بالليل ہیں ـــــ ایسے اولیاء اللہ سے جو بھی کبھی ٹکرایا ہے وہ ریت کے ٹیلوں کی طرح بکھر گیا ہے ـــــ پس یہ تھا صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ ورحمہ اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا سلوک یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ بیت اللہ میں نماز کا ثواب لاکھ گنا اور حرم نبوی میں پچاس ہزار گنا ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کرامؓ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی نمازیں چھوڑ کر جہاد وقتال کے لیے نکلے۔ اس لیے کہ اللہ کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی سعی وجہد سب سے بڑا فرض منصبی ہے۔ یہ حرم شریف اور حرم نبوی میں نمازیں ادا کرنے سے بھی زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یہ تقرب بالفرائض میں شامل ہے۔ جس کے بغیر تقرب بالنوافل ممکن ہی نہیں۔

ترتیب بدل گئی دورِ خلافت راشدہ کے بعد ہمیں اپنے بزرگانِ دین کی اکثریت میں تقرب بالنوافل کثرت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس دور کے لیے اس کی توجیہہ بھی ہے، جواز بھی ہے اور اس کا صحیح مقام ومحل بھی سمجھ میں

آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت کی معلوم و متمدن دُنیا کے ایک بہت ہی بڑے خطے پر اللہ کا دین قائم و نافذ ہو چکا تھا۔ اللہ ہی کا کلمہ اور جھنڈا سربلند تھا۔ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا کا مشاہدہ دنیا چشم سر سے کر رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب تقرب بالفرائض کو صرف شہادتین اور چار ارکانِ اسلام نماز روزہ زکوٰۃ اور حج میں محدود سمجھنے کا تصور اور عقیدہ و نظریہ پختہ ہوتا چلا گیا اور تواصی بالحق، دعوت الی اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، شہادت علی الناس، اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ، سعی و محنت اور قتال فی سبیل اللہ کو دینی فرائض کی فہرست سے خارج سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ ہمارے دینی نظام زندگی کا پورا قصر مسمار اور سرنگوں، شریعت پائمال۔ احکام الٰہی اور سنت رسول کالعدم حدود اللہ ساقط اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ بکمال و تمام دُنیا کے کسی گوشے بھی قائم و نافذ نہیں اور صورتِ حال وہ ہو گئی تھی جس کو مولانا حالی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یوں تعبیر کیا۔ ؎

وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

لیکن سلوک کا جو راستہ تصوف نے متعین کیا تھا، وہی چل رہا ہے۔ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ نہیں رہا حالانکہ صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب پھر اُسی سلوک کی ضرورت ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا۔

تجدیدی کوششیں

جن حضرات نے ہندوستان اور خاص طور پر دورِ مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان میں عوامی سطح پر خرابیاں تھیں، فسق و فجور بھی تھا۔ اکبر کا دین الٰہی بھی آگیا تھا۔ لیکن شریعت کا ڈھانچہ موجود تھا۔ شرعی عدالتیں قائم تھیں، قاضی موجود تھے۔ حضرتِ مجدد الف ثانی نے تلوار نہیں اٹھائی۔ لیکن سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر صوفیا کے حلقوں میں سے جس بزرگ ہستی کی طرف سے پہلی مرتبہ زور دار اگر کوئی دعوت اٹھی ہے اور اس کو emphasise

کیا گیا ہے تو وہ شخصیت تھی حضرت شیخ احمد سرہندی کی رحمہ اللہ علیہ ـــــ جہاں سے میں نے آج اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ ـــــ اس کے بعد جب انگریز آگیا اور ہماری پوری عمارت ہی زمین بوس ہوگئی تو اب ایک اور احمد اٹھا۔ یہ احمدؐ کے نامِ نامی کی برکات سمجھ لیجئے ـــــ وہ احمد سرہندی تھے رحمہ اللہ اور یہ سید احمد بریلوی تھے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ـــــ یہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے جہاد کا نعرہ لگایا۔ [1] انہوں نے سلوک محمدیؐ کو تازہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا سلسلہ "سلوکِ محمدیہ" ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ سلوک کے چار مشہور سلاسل ہیں۔ سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ نقشبندیہ، سلسلۂ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ۔ انہوںؒ نے نہایت زور دے کر کہا کہ ہمارا طریقہ اور ہمارا سلوک وہ ہے، جس میں جنگ اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔ جس میں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجانا ہے۔ یہ طریق و سلوکِ محمدیہؐ ہے۔ جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اسی کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں اور اسی پہ ہم عمل پیرا ہیں۔ اور اس سلسلۂ محمدیہؐ کا ذکرِ اوّلین ہے قرآن مجید۔

ہمارا تصوّرِ دین

اسی تصور کو ہم نے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا ہے۔ جو سید احمد بریلوی شہیدؒ کے بقول طریق و سلوک محمدیہؐ علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام ہے ـــــ تقرب الی اللہ کا ہمارا جو تصور ہے، طریقت اور سلوک کے بارے میں ہمارے جو نظریات ہیں۔ ہمارے نزدیک تقرب الی اللہ کے جو وسائل اور ذرائع ہیں، ان میں جو تناسب اور نسبت (RATIO PROPORTION) ہے ان امور کے بارے میں میں نے اپنی امکانی حد تک وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ ہمارا موقف آپ حضرات کے سامنے آگیا ہوگا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے

---

[1] حال ہی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی کتاب "پرانے چراغ" میں ولی اللّٰہی حکمت کے متعلق یہ شعر نظر سے گزرا ؎ یہی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ
جسے تو مدرسہ و خانقاہ اٹھے تو سپاہ (مرتب)

کہ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ !

فرائض دینی کا صحیح تصوّر

آج جن موضوعات پر مجھے اظہارِ خیال کرنا تھا ان میں سے آخری بات رہ گئی ہے، اب میں اس طرف آتا ہوں ۔۔۔ اب تک کی گفتگو اسی سوالیہ نشان تک پہنچ گئی ہے کہ "از روئے قرآن حکیم ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں؟" جو آج کے اس اجتماع کے دعوت نامے میں سرِ فہرست درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کی بھی وضاحت کرنی ہے کہ "آیا ان کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن نہیں ہے ۔۔۔۔ ان دونوں باتوں کو اگر سمجھ لیا جائے تو ساری گفتگو مکمل اور پورا مسئلہ حل ہو جائے گا ۔۔۔ اس موقع پر میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ایک درخت کا تصوّر کیجئے۔ اس کی جڑ ہے۔ اس سے چار شاخیں نکلیں ہوئی ہیں جن سے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں پھوٹتے ہیں۔ الغرض BRANCHING کا ایک سلسلہ ہے۔ یہی مثال اپنے دینِ اسلام کی سمجھئے۔ ساتھ ہی یہ بھی جان لیجئے کہ "فرض" کا تصور آپ کو ہر سطح (LEVEL) پر ملے گا ۔۔۔ سب سے پہلا اور بنیادی فرض انسان کا یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بنے ۔۔۔ یہ اس کا تنا ہے ۔۔۔ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ اور کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔ اس سے آگے یہ مطالبہ آئے گا کہ نماز بھی پڑھیں۔ وہ بھی فرض۔ یہ تنے سے شاخیں پھوٹ رہی ہیں ۔۔۔ پھر نمازوں میں کچھ فرائض ہیں کچھ سنتیں ہیں۔ اب ایک شاخ سے بہت سی شاخیں پھوٹ گئیں۔ آپ نے چار رکعت کی نیت کی۔ اب اس میں بھی کچھ فرائض ہیں۔ اس میں سورۂ فاتحہ کی قرأت لازم ہے، فرض ہے۔ اس میں رکوع و سجود واجب ہے اور فرض ہے۔ تو یہ فرض یہاں سے وہاں تک چل رہا ہے۔ اسی طرح جن نمازوں کو ہم سنتیں یا نوافل کہتے ہیں۔ ان میں بھی یہی فرائض موجود ہیں۔ فرائض کا بنیادی تصور پھر فرائض کا ثانوی تصور ان سب کو اس ترتیب کے ساتھ نہیں سمجھیں گے تو ذہن کے اندر ایک الجھاؤ اور انتشار (CONFUSION) رہے گا۔ نماز پڑھ لی، فرض ادا ہو گیا۔ روزہ رکھ لیا۔ فرض ادا ہو گیا۔ صاحب نصاب ہیں تو زکوٰۃ ادا کر دی، صاحب استطاعت

ہیں تو حج کر لیا۔ یہ دونوں فرائض بھی ادا ہو گئے۔ اب اور کون سا فرض باقی رہ گیا! اب اور کون سے فرائض ہیں، جن کی ادائیگی کا مطالبہ ہے۔!

اسی لیے آج کی اس گفتگو کے موضوعات میں سے پہلی شق میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ" از روئے قرآن حکیم ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں۔ ہے۔

عبادتِ ربّ

ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں، لہٰذا بنیادی فرائض کو آپ ایک لفظ میں سمجھنا چاہئیں تو وہ ہے" عبادت رب"۔[1] اللہ کے بندے بنو۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید میں دو اصطلاحات اور آتی ہیں۔ ایک ہے اَطِيْعُوا اللّٰه ۔ اللہ کی اطاعت کرو۔ دوسری ہے اَسْلِمُوْا ۔ سرِ تسلیم خم کرو۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ بندے بنو، غلامی اختیار کرو، بندگی کی روش اختیار کرو، اطاعت کرو، گردن جھکا دو، سرِ تسلیم خم کر دو۔ فرماں برداری کا وطیرہ اپناؤ ــــــ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ پہلا فرض جو سارے فرائض کی جڑ اور بنیاد ہے وہ ہے 'عبادت رب' ــــــ اور یہ کوئی آسان کام نہیں، بڑا کٹھن ہے۔ اس راہ میں بڑے بڑے موانع ہیں۔ سب سے پہلا مانع ہمارا اپنا نفس ہے۔ ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست   لیکن اُو را عون ما نیرا عون نیست

نفس نہیں مانتا، خواہشاتِ نفس اس راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ پھر ماحول نہیں مانتا۔ خود اپنے بیوی بچے آڑے آتے ہیں۔ برادری نہیں مانتی، رشتہ دار نہیں مانتے۔ موانع کا ایک دائرہ۔ دوسرا دائرہ تیسرا دائرہ۔ ان میں سے ایک ایک سے عہدہ برا ہونا ہے۔ ؎

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف" مطالبات دین" کا مطالعہ ان شاء اللہ مفید مطلب ہوگا۔ (مرتب)

حقیقی مفہوم

پہلا اور بنیادی فرض یہ ہے کہ اللہ کے بندے بنو۔ لیکن بندگی جزوی مطلوب نہیں ہے۔ جزوی ہوتی ہے ملازمت۔ غلامی نہیں ہوتی۔ غلام سوچا غلام ہوتا ہے۔ غلام ہمہ وقت غلام ہوتا ہے۔ ملازمت ایک جزوی معاملہ ہوتا ہے۔ آٹھ گھنٹے کام کروں گا۔ سال میں اتنی چھٹیاں بھی لوں گا۔ ان آٹھ گھنٹوں کے بعد تو کون اور میں کون! اب ملازمت کا تعلق جاری نہیں، اب سب برابر ہیں، کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ جو فرض میرے ذمہ کیا گیا ہے اور جو ڈیوٹی معین کی گئی ہے، وہی کروں گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ مجھے دفتر میں جھاڑو دلوانے لگ جائے ــــ ملازمت تو یہ ہے۔ لیکن عبدیت! وہ ہمہ تن سپردگی اور ہمہ وقت بندگی کا نام ہے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً - اپنے پورے وجود، اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں سمیت اسلام میں داخل ہونا پڑے گا۔ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو اللہ کی فرماں برداری کا خوگر بناتا ہوگا ــــ یہاں ایک حکم توڑا جان بوجھ کر توڑا۔ سرکشی کے جذبے کے تحت توڑا۔ اس پر اصرار کیا تو ایک جرم، ایک خلاف ورزی اور ایک نافرمانی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دے گی۔ بَلٰى مَنْ

كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲-۸۱)

"کیوں نہیں! جس کسی نے اپنے دلی ارادے کے ساتھ ایک بُرائی کمائی اور اس کی اس خطاکاری نے اس کو گھیرے میں لے لیا تو وہ دوزخی ہے اور وہ اس ہی میں ہمیشہ رہے گا۔"

ایک خلاف ورزی، ایک جرم، ایک قانون کا توڑنا۔ سرکشی کی نیت و ارادہ اور اس پر اصرار سب نیکیوں کو ختم کر دے گا ــــ دین میں جزوی اطاعت درکار نہیں کلی اطاعت درکار ہے۔ جزوی اطاعت پر تو قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غیض و غضب کا اظہار فرمایا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا

جَزَآءُ مَن يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

"پس کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ اُن حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

اس آیت کے تیور پہچانیے۔ اس میں کس قدر غیض و غضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ کیا روش ہے اور یہ کیا اطاعت ہے کہ تم کتاب کی کچھ باتیں مانتے ہو اور کچھ نہیں مانتے؟ یہ حکم ہمارا تھا، وہ سر آنکھوں پر! اور وہ حکم بھی ہمارا تھا، اُسے پاؤں تلے روند دیا! یہ ڈھٹائی! یہ گستاخی! اس کی سزا یہی ہے کہ دُنیا میں تم کو رسوا اور خوار کر کے رکھ دیا جائے اور آخرت میں تم کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے اور اس غرّے میں نہ رہنا کہ اللہ کو دھوکہ دے لوگے اور وہاں بھی تمہارا چھل اور فریب چل جائے گا۔ جان لو کہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ اسی طرح تم خود کو دھوکہ دیتے ہو حالانکہ تم سمجھتے یہ ہو کہ اللہ اور مومنین کو دھوکہ دے رہے ہو: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس آیت "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ . . . اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَة" کے مخاطب یہود ہیں۔ سورہ بقرہ کے پانچویں رکوع سے سولھویں رکوع تک یہودیوں کے خلاف قرار داد جرم عائد ہوئی ہے کہ ہم نے تم پر کیا کیا انعامات و احسانات کیے اور تمھاری سرکشی اور نافرمانی کی کیا کیا روش رہی اور تمھارا بغاوت کا کیا کیا طرزِ عمل رہا۔ اسی کی پاداش کی پہلی قسط کے طور پر تم پر دنیا میں ذلّت و مسکنت مسلط کر دی گئی ہے اور آخرت میں ہمارا عذاب الیم تمھارا منتظر ہے۔ اس آیت میں دراصل ان کے اس عظیم ترین جرم کا ذکر ہے۔ جو اُنھوں نے اللہ

تعالیٰ کے دین و شریعت کے ساتھ روا رکھا تھا۔ لیکن ـــــ بلا تشبیہ اور صرف افہام و تفہیم کے لیے عرض کرتا ہوں کہ جیسے ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ بہو کو متنبہ کرنا ہو تو اس کے سامنے بیٹی کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ سابقہ امم کے واقعات و حالات ان کی بد اعمالیاں ان کے کرتوت اور ان پر عذاب کے جو کوڑے برسے اور وہ اس دُنیا میں جس انجام بد سے دوچار ہوئے۔ اس کا ذکر سبق آموزی اور عبرت پذیری اور امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انتباہ کے لیے بھی ہوتا ہے کہ دیکھنا نافرمانی اور سرکشی کی۔ وہ روش اور طرزِ عمل اختیار نہ کرنا جو مغضوب و ضال امم نے اختیار کیا تھا۔ اگر تم نے بھی وہ ہی کچھ کیا جو انھوں نے کیا تھا۔ تو ہمارا قانون بے لاگ ہے۔ ہماری سنّت اٹل ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ، تمھارے ساتھ بھی وہی کچھ سلوک ہوگا جو نافرمان اور سرکش اممِ سابقہ کے ساتھ ہو چکا ہے۔

پہلا اور بنیادی فرض

یہ ہے حضرات ہمارا پہلا اور بنیادی فرض۔ پوری ہمہ گیری اور گمبھیرتا کے ساتھ۔ یہ فرض وہ ہے جس کے لیے ہماری تخلیق ہوئی : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام یہی دعوت، یہی پکار اور یہی صدا دیتے ہوئے مبعوث ہوئے : يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ ؕ - اور : أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ط ـــ قرآن مجید بھی آیا تو اسی دعوت اور پکار کے لیے : يٰأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ اور الٓرٰ كِتٰبٌ أُحْكِمَتْ آيٰتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۙ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ ط - اور إِنَّنِي أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي ○ تمام انبیاء و رسل ؑ کی امتوں کو یہی حکم دیا گیا کہ وہ ہر طرف سے مُنہ موڑ کر اور یکسو ہو کر صرف اللہ کی بندگی کریں اور اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کریں : وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ ۔

دُعا کو نبی اکرم ﷺ نے عبادت کا جوہر بھی قرار دیا ہے اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دعا ہی اصل

عبادت ہے : اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ - قرآن مجید نے اس کی طرف ان الفاظ میں دعوت دی کہ:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ (المومن ۶۰)

" اور تمھارا رب فرماتا ہے کہ مجھ ہی کو پکارو، مجھ ہی سے مانگو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ شتاب ذلیل و خوار ہو کر لازماً جہنم میں داخل ہوں گے۔"

سورہ بنی اسرائیل (آیت ۲۳) میں ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل فیصلے کے طور پر فرمایا:

" وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ "

" آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔"

الغرض دعوتِ عبادت رب قرآن حکیم کا اصل موضوع خطاب ہے ۔ میں اس موقع پر وقت کی کمی کی وجہ سے ان ہی چند آیات کو پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

شہادت علی الناس

البتہ اس عبادتِ ربّ سے دو چیزیں اور نکلتی ہیں۔ اگر عبادت صحیح رُخ پر ہے، دھوکہ اور فریب نہیں ہے۔ جزوی نہیں ہے کلّی ہے تو پہلی یہ کہ جب آپ اللہ کے بندے بنیں گے تو آپ کی شخصیت سے عبادت رب کی خود بخود ایک خاموش تبلیغ شروع ہو جائے گی۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں۔ دُنیا اندھی تو نہیں ہے [1] آپ سے آپ لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسا کیوں کر رہا ہے۔ ! اس نے یہ کام کیوں کیا؟ حالا

---

[1] زمانہ حال میں کتنے ہی غیر مسلموں کے دلوں میں نماز باجماعت کی ہیبت کو دیکھ کر ہی اسلام کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور اس مطالعے نے بدیہیات فطرت کو بیدار کیا نتیجۃً وہ مشرف بالاسلام ہو گئے۔ (مرتب)

اس لیے نقصان اٹھائے کہ وہ اللہ کی بندگی کا دعویدار ہے اور وہ بڑے سے بڑے نفع و فائدے کے راستے کو صرف اس لیے اختیار نہ کرے کہ اس میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے تو یہ ہے اصل اور حقیقی تبلیغ۔ کوئی بندۂ مومن دین کی خاطر زمانے کے غیر اسلامی چلن کو چھوڑ کر خطرات مول لے، مالی نقصانات انگیز کرے استہزا اگوارا کرے تو اس کے وہ اثرات مترتب ہوتے ہیں جو خالی خولی واعظوں سے نہیں ہو سکتے ـــــــ پھر اگر شرافت و مروت ہے تو جو چیز آپ نے اپنے لیے پسند کی تو کیا وہ ہی چیز آپ اپنے بھائی کے لیے پسند نہیں کریں گے ۔ ؟ اگر غیرت و حمیت ہے تو اللہ کے دین کے خلاف جو عمل آپ کو نظر آئے گا اس پر آپ کے خون میں جوش نہیں آئے گا ؟ آپ کی غیرت بھڑکے گی نہیں ۔ ؟ ؟ یہ سارے تقاضے ہیں جو خود بخود عبادت رب کا راستہ اختیار کرنے سے ابھرتے ہیں ـــــــ دعوت و تبلیغ ، نصیحت و تلقین ، امر بالمعروف نہی عن المنکر یہ سب برگ و بار اور ثمرات عبادت رب کے شجر طیبۃ سے آپ سے آپ پھوٹیں گے ۔

اس میں اس کا نقصان ہو گیا ـــــــ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ شخص یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے جذبے سے کر رہا ہے اللہ کے حکم کے مطابق کر رہا ہے تو ان کے جو احساسات ہوں گے ، ان کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ اس سے بڑی تبلیغ کوئی ہے ہی نہیں ، چاہے آپ نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا ہو ۔ کوئی بندہ مومن صرف

خود ہی غور کیجیے کہ اگر آپ اللہ کا بندہ بننا چاہتے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے جب تک آپ اپنے گرد اگرد بندگی رب کا ایک ماحول پیدا نہ کریں ! آپ اپنے گھر میں بھی اللہ کے بندے نہیں بن سکتے جب تک پورے گھر پر بندگی رب کی چھاپ موجود نہ ہو ۔ بیوی بھی اللہ کی بندی ہو ، اولاد بھی اللہ کی بندگی کو اختیار کیے ہوئے ہو تو گھر میں بندگی رب کا ماحول بنے گا ۔ اس سے آگے آپ کے لیے ضروری ہوگا کہ محلے میں بندگی رب کا ماحول پیدا کر دیں ورنہ آپ کا بچہ باہر نکلے گا تو گالی سیکھ کر آئے گا ، وہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی سیکھ کر آئے گا ۔ آپ اُسے کسی تہہ خانے میں بند کر کے نہیں رکھ سکتے ۔ آپ کو اپنے محلے میں ، اپنی آبادی میں ، اپنے شہر میں اپنے ملک میں اور پھر پوری دُنیا میں عبادت ربّ

کا نظام قائم کرنا ہوگا۔ اگر آپ فی الواقع بتمام وکمال خود بندۂ رب بننا چاہتے ہیں۔

اقامتِ دین اس طرح عبادتِ رب ہی کے لازمی تقاضے کے طور پر ہمارے سامنے دین کا یہ مطالبہ آتا ہے اَنْ اَقِیْمُوْا الدِّیْنَ - دین کو قائم کرو۔ اس کا ہی نام ہے فریضۂ اقامتِ دین۔ ماحول پر بندگیٔ رب قائم ہوگئی تو دین قائم ہوگیا —— گھر پر دین قائم کرو، اپنے محلے اور بستی میں دین قائم کرو۔ اپنے شہر اور ملک میں دین قائم کرو۔ پھر دین کی آفاقی دعوت کے علمبردار بن کر پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے قیام و نفاذ کے لیے جد وجہد کرو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

"فرمان روائی اور حکمرانی کا اقتدار و اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اُسی کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی دین قیّم ہے۔"

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت میں عبادتِ رب کے امر (حکم) سے پہلے یہ بات واضح کردی گئی کہ حاکمیت (SOVEREIGNTY) صرف اللہ ہی کے لیے ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اور جب پورا نظام زندگی اللہ کی حاکمیت کے تصور پر قائم ہو تو اسی کا نام ہے الدین القیم۔

لفظ دین کا حقیقی مفہوم اسی مقام و موقع پر لفظِ دین کے معنی و مفہوم کو بھی سمجھ لیجیے۔ اس کا اصل مفہوم "جزا و سزا" اور "بدلہ" ہے۔ اس بنیادی تصور کے تمام مقتضیات مضمنات ومضمرات اور لوازم کے اجتماع سے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح "الدین" بنی ہے۔ جس کا ازروئے قرآن حکیم مفہوم و مطلب ہوا کہ:

"دین کے معنی ہیں ایک پورا نظام زندگی مکمل ضابطہ حیات اور اکمل و اتم دستور و آئینِ اطاعت جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع - مقنن (LAW GIVER) اور حاکم مطلق (ABSOLUTE SOVEREIGN)

مان کر اس کی سزا کے خوف اور اس کے انعام کے ذوق و شوق سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے :

پس حکم ہوا اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ اور وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط "اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے" یہ اسی عبادتِ رب کے اس عہد کا تقاضا ہے جس کی ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں تجدید کرتے ہیں کہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے[1] پس لازم ہوا، واجب و فرض ہوا کہ ہم خود بھی حقیقی معنوں میں اللہ کے بندے بنیں اور ساتھ ہی ہم اپنے گھر پر اپنے محلے اور بستی پر اپنے شہر اور ملک پر اور پھر کل روئے زمین پر عبادتِ رب کا نظام یا بالفاظِ دیگر دین الحق کو قائم، غالب اور نافذ کرنے کی سعی و کوشش کریں۔ اسی کے لیے محنت ہو اسی کے لیے تگ و دو ہو اسی کے لیے بھاگ دوڑ ہو اسی کے لیے سونا ہو۔ اسی کے لیے اٹھنا ہو اسی کے لیے بیٹھنا ہو اسی کے لیے جینا اور مرنا[2] ہو اسی کے لیے لوگوں سے جا کر ملنا ہو۔ اسی کے لیے اپنے ذہن و فکر کی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہو اسی کے لیے جسم و جان کی توانائیوں کو کھپانا اور اسی کے لیے سوچ بچار کرنا ہو اور حال یہ ہو کہ ؎

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں
اے ہجوم نا امیدی دل بہت گھبرائے ہے

یہ ساری چیزیں عبادتِ رب میں شامل ہیں۔ یہی سنتِ رسول ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یہی تقرب الی اللہ بالفرائض ہے۔ تینوں باتیں ایک ہی ہیں ——— اور یہی ہے سلوک محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔

حضورؐ کے امتی ہونے کے لوازم

اب تک تمام گفتگو عبادتِ رب کے حوالے سے ہوتی رہی ہے۔ حالانکہ ہماری نسبتیں دو ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور دوسری یہ کہ ہم محمدؐ کے امتی ہیں۔

---

[1] عربی میں فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں زمانوں (TENSES) کا مفہوم موجود ہوتا ہے (مرتب)

[2] ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔

صلّی اللہ علیہ وسلم ـــــ اب تک میں نے عبادتِ رب کی کوکھ سے برآمد کر کے چند چیزیں آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ دعوت، تبلیغ، تلقین، نصیحت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ دین کو اپنے گھر، اپنے محلے، شہر، ملک اور پوری دُنیا میں قائم کرنے کی جدوجہد یہ سب عبادت ربّ ہی کے تقاضے ہیں ـــــ اب آیئے غور کریں کہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے امتی ہونے کے اعتبار سے ہمارے فرائض اور ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ آنحضورؐ کے امتی ہونے کی وجہ سے اس میں ایک مزید رُخ اور پہلو (DIMENSION) کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اپنے طور پر بندگیٔ رب کے تقاضے کے طور پر یہ کام کر رہا ہے اور ایک وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ مامور فرمادے کہ تجھے کرنا ہی یہ کام ہے۔ معاملہ بہت بلند اور ارفع ہو گیا۔ نبیؐ بندہ بھی ہے اور رسُول بھی ہے۔ نَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ ـــ انؐ کی عبدیت کا بھی تقاضا تھا، نوعِ انسانی کے لیے نصح اور خیرخواہی۔ اور اس کی نجات کے لیے فکرمند اور متمنی ہونا ـــــ اور رسُول ہونے کی حیثیت سے فرضِ منصبی یہ قرار پایا ہے کہ تم اس کام پر مامور من اللہ ہوئے ہو اب جاؤ ایک ایک شخص کے پیچھے جاؤ۔ ایک ایک کے گھر پر دستک دو۔ ایک ایک کے دل پر جا کر صدا لگاؤ۔ اسلئے کہ تم ابھی رسول ہو۔ تم تو اس کام پر مامور ہوئے ہو۔ تمہارا معاملہ عام اولیاء اللہ والا نہیں ہے۔ تم جب رسول بنا کر مامور کیے گئے ہو تو تمہاری ذمہ داری سوا ہو گئی ہے۔

ہر امتی رُسُول ہے

آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رسول نہیں ہیں۔ یہ بڑا مغالطہ ہے آپ بھی رسول ہیں۔ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ایک ایک شخص رسول ہے۔ کیوں؟ یہ سوال غور طلب ہے! اس لیے کہ ہمارا ایمان ہے کہ نبوت و رسالت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچی اور اکمال و اتمام پر بھی ـــــ اب کارِ رسالت کی ذمہ داری امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بحیثیت امت عائد کر دی گئی ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرہ ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمھیں امتِ وسط (بہترین گروہ) بنایا ہے تاکہ تم (دُنیا کے) لوگوں پر گواہی دینے والے بن جاؤ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہے۔"

اور " وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ

" (اے ایمان لانے والو!) اور اللہ کے لیے جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمھیں اپنے (اس) کام کے لیے چُن لیا ہے۔ اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملّت پر۔ اس نے پہلے بھی تمھارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تاکہ تم پر گواہ ہو جائیں رسُول اور تم لوگوں (بنی نوعِ انسان) پر گواہی دینے والے بن جاؤ۔"

آگے چلتے فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران ۱۱۱)

"تم (دُنیا میں اب) بہترین امّت (گروہ) ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی اور ہدایت و اصلاح) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ تمام آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد کارِ رسالت یعنی نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دینا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر دی، امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کاندھوں پر عائد کر دی گئی ہے۔

جن لوگوں نے اناجیل کا مطالعہ کیا ہے، اُنھوں نے دیکھا ہوگا کہ ان میں یک مستقل باب ہے و رسولوں کے افعال' (ACTS OF THE APOSTLES) یہ رسول (APOSTLES) کون ہیں! یہ تھے حواریِن حضرت مسیح علیہ السلام — ان کا تصور ہمارے تصور سے قدرے مختلف ہے۔ اُنھوں نے حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ قرار دے کر الوہیت کے مقام پر پہنچایا تو ان کے شاگردوں کو باقاعدہ رسُول بنا دیا — اُنھوں نے ایک ڈگری ان کو اونچا اٹھا دیا۔ لیکن تصور ہمارا ابھی وہی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ نے بھیجا رسول کو صلّی اللہ علیہ وسلم۔ رسُول نے اُمتیوں کو اُسی کام کے لیے لوگوں کی طرف بھیجا کہ جاؤ لوگوں تک یہ دعوت پہنچاؤ۔ اس کی تبلیغ کرو — مثلاً حضورؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ دارِ ارقم میں آنجنابؐ کی مجلس میں چند صحابہ کرامؓ حاضر ہیں۔ اُنھوں نے آنحضرتؐ سے نازل شدہ وحی سیکھی اور مکّہ میں ان لوگوں کو پہنچادی جو ایمان لاچکے تھے لیکن ہمہ وقت صحبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ کو یاد آگیا ہوگا کہ جب حضرت عمرؓ مشرف بالاسلام ہونے سے قبل یہ خبر سُن کر کہ ان کی بہن اور بہنوئی (حضرت فاطمہؓ بنت خطاب اور حضرت سعیدؓ بن زید) مسلمان ہوچکے ہیں غیض وغضب کی حالت میں انؓ کے گھر پہنچے تھے تو حضرت خبابؓ ابن اردت ان میاں بیوی کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہے تھے۔ یہ اصحابؓ رسُولؐ گویا ایک طرح پیغام وحی پہنچانے کے لیے "پیغامبر" کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس طرح کارِ رسالت میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے "رسُول" تھے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۱ھ نبوی میں بارہ اشخاص یثرب (مدینہ منورہ) سے آئے اور بیعتِ عقبۂ اولیٰ ہوئی۔ اس موقع پر ان حضراتؓ نے نبی اکرمؐ سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی ایسا شخص دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائے اور احکام اسلام سکھلائے۔ آنحضورؐ نے اس خدمت کے لیے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مامور فرمایا۔ غور کیجیے کہ وہ کس کے مامور کردہ اور کس کے رسُول ہیں! یہ ہیں رسُولِ رسُولِ اللّٰہ — اللہ کے رسولؐ کے فرستادہ — اللہ کے رسولؐ کے بھیجے ہوئے۔ اللہ کے رسولؐ کے رسول — اس

معنی میں ہر امتی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہے ــــــ یاد کیجئے کہ جب رستم سپہ سالار افواج ایران نے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایران پر یلغار کا سبب معلوم کیا تھا تو اس کے جواب میں حضرت سعدؓ نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے :

"اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجِهَالَةِ اِلٰی نُوْرِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْکِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ۔

"بلاشبہ ہم بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نورِ ایمان کی طرف اور بادشاہوں کے ظلم وستم سے عدلِ اسلام کی طرف نکالیں۔"

اس میں لفظِ اُرْسِلْنَا، خاص طور پر قابلِ توجہ ہے ۔ حضرت سعدؓ صاف بتا رہے ہیں کہ " ہم خود نہیں آئے بھیجے گئے ہیں " اور یہ بھیجنے والے کون ہیں ؟ یہ ہیں جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ یہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ ایمان سے بہرہ مند کرنے اور ملوک کے پنجہ جور وستم سے نجات دلا کر اسلام کے نظامِ عدل و انصاف سے مستفید کرنے کے لیے بھیجے ہوئے لوگ ہیں ، یہ ہیں رسول اللہ کے رسول۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ ــــــ یہ ہیں وہ نفوسِ قدسیہ جو سلوکِ محمدی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام کی ارفع اور بلند ترین منزلیں طے کرنے کی خاطر میدانِ قتال کے لیے ہتھیلی پر جان رکھ کر نکلے تھے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔

خلافتِ راشدہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اسی کارِ رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انجام دہی اور دعوتِ محمدیؐ کی توسیع نبی اکرمؐ کی طرف سے عاید کردہ ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول کی حیثیت سے بنی نوع انسان تک دعوتِ الی اللہ، تبلیغ واظہارِ دین الحق کے لیے نکلے تھے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تعمیل میں نکلے تھے ــــــ وہ اس لیے نکلے تھے کہ حجۃ الوداع میں دین متین کی اہم تعلیمات کی تذکیر، حقوق انسانی کا ایک منشور اور ہدایاتِ ربانی کا ایک خلاصہ پیش فرمانے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ

وسلّم نے کمالِ حکمت کے ساتھ شہادت علی الناسؓ اور دعوت و تبلیغ دینِ حق گویا کہ اپنی رسالت کی ذمہ داری امت کی طرف اس طرح منتقل فرما دی کہ خطبے کے آخر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے آپؐ نے دریافت فرمایا (جن کی تعداد بعض روایات میں ایک لاکھ چودہ ہزار اور بعض میں ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان ہوئی ہے)۔

اَلَاهَلْ بَلَّغْتُ

"لوگو! میں نے (خدا کا پیغام) تم تک پہنچا دیا کہ نہیں؟"

آنحضرتؐ نے یہ بات تین مرتبہ دریافت فرمائی اور صحابہؓ نے تینوں مرتبہ جواب دیا:

قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ

"بے شک آپ نے (خدا کا پیغام) پہنچا دیا۔ حقِ امانت اور حقِ نصح اور خیر خواہی ادا فرمایا۔"

اس کے بعد آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلّم نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور انگشت شہادت سے آسمان کی طرف پھر صحابہ کرامؓ کے مجمع کی طرف تین بار اشارہ کرکے تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ

"اے اللہ تو بھی گواہ رہے۔"

پھر دعوت و تبلیغ اور کارِ رسالت کی ذمہ داری امت کی طرف یہ ہدایت دے کر منتقل فرما دی کہ: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

"پس اب جو لوگ یہاں موجود ہیں، ان کا فرض ہے کہ اُن تک پہنچائیں جو یہاں نہیں ہیں۔"

یہ ختم نبوّت و رسالت کا لازمی نتیجہ ہے کہ امتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اجتماعی طور پر کارِ رسالت کی انجام دہی کے لیے فائز کی گئی ہے اور امتِ مرحومہ کا ہر فرد دعوت و تبلیغ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جد و جہد کے لیے مامور ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا رسول ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تالیف "مطالبات دین" کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔

ہم امّت اجابت ہیں

قرآن حکیم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا قائم مقام ہے اور اس کی دعوت و تبلیغ میں آنحضورؐ نے یہ فرما کر ہر امتی کے لیے کارِ رسالت کی انجام دہی میں آسانی پیدا فرما دی ہے کہ :

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

"پہنچاؤ میری جانب سے اور چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ"

پس بحیثیت امّت ہم مامور من اللہ ہیں ۔ شخصاً رسالت ختم ہوگئی ۔ تاہم امت کی حیثیت سے امتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فریضۂ رسالت کی ادائیگی پر مامور ہوگئی ——
اسی سورۂ حج کی آخری آیت میں امّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے لئے فرمایا :

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ

یہ ہے نبی اکرمؐ کے امتی ہونے کے اعتبار سے ہماری ذمہ داری کا دوسرا رُخ۔

ساری دُنیا امّت دعوت ہے

ہر امتی پر لازم ہے ' واجب ہے ۔ فرض ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ ، تلقین و نصیحت ، امر بالمعروف نہی عن المنکر ، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے اپنے جان و مال کو لگائے اور کھپائے اور جیسے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تیئس ۲۳ سال مسلسل محنت شاقہ اور جاں گسل مساعی کے نتیجے میں جزیرہ نماعرب کی حد تک اللہ کے دین کو عملاً قائم و نافذ کیا ویسے ہی امّت کے ذمّہ ہے کہ وہ پورے روئے زمین پر —— اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنے کی جد و جہد کرے —— یہ ہیں از روئے قرآن ہمارے فرائض دینی —— ہم جن فرائض (نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج) سے واقف ہیں ، وہ اسلام کے ارکان ہیں ۔ لیکن ہمیں تو پوری زندگی عبادت ربّ میں بسر کرنی ہے لہذا عبادتِ ربّ ہی کے تقاضے کے طور پر یہ تمام امور جن کو میں نے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ہمارے دینی فرائض میں شامل ہیں۔

فرائض کا جامع تصوّر

حضرات ! میں نے قرآن حکیم ، سنت رسُول ، سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ، سیرِ خلفاء راشدین مہدیین

اور سیرِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرائض دینی کو جس طرح سمجھا ہے اس کو اپنی استعداد اور امکانی کوشش کی حد تک آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ آپ کے سامنے دینی فرائض کا وہ جامع و اکمل تصور آجائے جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہمارے سامنے ہے ـــــ ہمارے نزدیک عبادتِ رب کے اس ہمہ گیر تصور کا جزو لاینفک ہیں وہ فرائض، جن کو بدقسمتی سے کُل فرائض دینی سمجھ لیا گیا ہے۔ نماز فرض، روزہ فرض صاحب نصاب پر زکوٰۃ اور ہر صاحب استطاعت پر حج فرض ہے۔ یہ اسی عبادتِ رب کی اصل کی فروع ہیں ـــــ پھر نماز میں کیا کیا فرائض ہیں! روزے کے فرائض کیا کیا ہیں۔! حج کی ادائیگی میں کن مناسک کو فرائض کا درجہ حاصل ہے!! یہ فرائض کا تسلسل ہے جو عباداتِ مفروضہ کے ہر گوشے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ لیکن اگر عبادتِ رب کے جامع و ہمہ گیر فرض کی جڑ اور اصل قائم نہیں ہوئی۔ اس فرض کی بنیاد اگر ہماری زندگیوں میں استوار نہیں ہوئی تو ظاہر بات ہے کہ اس جڑ سے جو تنا اور پھر اس تنے سے جو شاخیں پھوٹیں گی اور پھر ان شاخوں پر برگ و بار آئیں گے وہ ناقص اور نامکمل رہیں گے ـــــ ہمارا اس وقت سارا معاملہ یہی ہے کہ فرائض دینی کا جو اصل اور حقیقی تصوّر ہے وہ بدل گیا ہے۔ مفروضہ عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) ہی کو کُل عبادت سمجھ کر وہ جو اصل اور بنیادی فرائض ہیں یعنی عبادت رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین، ان کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

حالانکہ بات بالکل سیدھی، صاف بلکہ آفتاب کی طرح روشن ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ط اس کی دعوت و تبلیغ اور اس کو کُل جنس دین یعنی نظام ہائے اطاعت پر غالب کرنا (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ) اصلاً فرضِ منصبی ہے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قُمْ فَاَنْذِرْ ٥ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اب جو دونوں (اللہ اور رسُول) پر ایمان کے مدعی اور دعویدار ہوں اُن کے خلوص و اخلاص کا اصل امتحان اور اصل کسوٹی یہ ہے کہ اگر اپنا تن من اس کام میں کھپا دیں

(لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا) اور اللہ اور رسولؐ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کریں (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ) تو کامیاب وکامران (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝) ورنہ خائب وخاسر اور ناکام ونامراد !!

ختم نبوت کالازمی تقاضا

حاصل کلام یہ ہے کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختم نبوّت و رسالت کا ایک لازمی ولابدی نتیجہ و تقاضا یہ ہے کہ جو فرائضِ منصبی آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی امّت کے ذمّے ہیں۔ گویا خواہ دعوت وتبلیغ، انذار وتبشیر، تعلیم وتربیت اور اصلاح وتزکیہ ہو جو بعثتِ انبیاء ورسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اولیٰ رہی ہے خواہ اعلاء کلمۃ اللہ، شہادت علی الناس، اقامتِ دین اور اظہار دین الحق علی الدین کلّہٖ ہو جو بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہے، جملہ اہل ارض اور جمیع کرّہ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عاید ہوتے ہیں جو عباد الرحمٰن اور نبی خاتم وخاتَم۔ رسولِ کامل واکمل جناب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے امتی ہونے کے مدّعی ہیں اور جو آپؐ کے نام نامی اسمِ گرامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے اور آپؐ کی امّت میں ہونے کو موجب سعادت سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ آنجناب صلّی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی ورسُول ہیں اور آپ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ ایکؐ اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تاقیام قیامت پوری نوع انسانی کی جانب ہے[1] بفحوائے آیات قرآنی: وَ مَا

---

[1] اس مسئلے کی شرح وبسط سے تفہیم کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تالیفات "نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت" اور دعوت الی اللہ کا مطالعہ انشاء اللہ مفید رہے گا۔ (مرتب)

اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا اور وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ٥
اور آنحضورؐ کے ابتدائی خطبے کے اس حصّے کے بموجب : اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَآصَّۃً وَّ اِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً ط پس نبی ورسولِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلّم کا مشن زندہ ہے، تابندہ ہے اور تا قیام قیامت زندہ رہے گا اب ہر بندۂ ربّ اور حضورؐ کے ہر اُمّتی کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ کارِ رسالت کے اس تسلسل کو جاری و ساری رکھے اور اسی راہ میں اپنی جان، اپنا مال اور اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو کھپا دینے کو اپنا فرضِ عین سمجھے اور اسی کو اپنے لیے سعادت متصور کرے۔

وقتِ فرصت کہاں کام ابھی باقی ہے   نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

لزومِ جماعت

اب آخری سوال یہ ہے کہ ان فرائض دینی سے عہدہ برا ہونا کیا واقعتاً انفرادی طور پر ممکن ہے ؟ اس سوال پہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے غور کیجئے۔ ہے کوئی شخص جو با قائمِ ہوش وحواس یہ کہہ سکے کہ ہاں یہ فرائض دینی انفرادی طور پر بھی ادا کیے جا سکتے ہیں ! تقرب بالنوافل یقیناً انفرادی طور پر ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ اس میں بالکلیہ انفرادیت ہی ہوگی۔ اس میں اجتماعیت ہوگی ہی نہیں۔ احناف کے نزدیک نفل نماز باجماعت (استثنائی حالات مثلاً تراویح اور اسی نوع کی دوسری نمازوں کے علاوہ) پڑھنا مکروہ ہے ـــــ لیکن غور کیجئے کیا تقرب بالفرائض انفرادی حیثیت میں ممکن ہے ! اقامتِ دین انفرادی اعتبار سے ممکن ہے !! اگر انفرادی طور پر ممکن ہوتا ـــــ میں اب وہ باتیں کہنے لگا ہوں، جن کے بعد کسی دلیل کی حاجت نہیں ہوگی۔ لہٰذا میری درخواست ہے کہ ان باتوں کو پوری توجہ سے سماعت فرمایئے۔

اقامت دین کیلئے جماعت ضروری ہے

اگر فی الواقع تقرب بالفرائض انفرادی طور پر ممکن ہوتا اور اگر دین کا قیام و اظہار، غلبہ اور نفاذ انفرادی طور پر ممکن ہوتا تو اللہ کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰ اور ان کے ساتھ ایک اور پیغمبر ہارون موجود۔ علیٰ نبیّنا وعلیہما السلام۔ لیکن

امت نے انکار کیا کہ ہم قتال نہیں کریں گے۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ نے ان کو بشارت دی تھی کہ "ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے۔ پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے"۔ اُنھوں نے اعراض کیا اور کہا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى
يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (المائدہ ۲۲)

"اُنھوں نے کہا اے موسیٰ! وہاں تو زبردست لوگ رہتے ہیں۔ ہاں اگر وہ وہاں سے نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں"

ان میں کے دو مومنینِ صادقین نے ان کو بہت ترغیب دی اللہ پر توکل رکھنے کی تلقین کی ان کو فتح کی یقین دھانی کرائی لیکن قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی اور کہا تو بڑی ڈھٹائی سے یہ کہا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝

"اُنھوں نے (پھر یہی) کہا اے موسیٰ ہم تو وہاں ہرگز اور کبھی نہیں جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب دونوں جاؤ اور لڑو ہم (تو) یہاں بیٹھے ہیں" (المائدہ ۲۴)

نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ کا عمل (PROCESS) وہیں رُک گیا۔ مشیتِ خداوندی میں ارضِ مقدس ان کو دی جانی طے کی جا چکی تھی۔ لیکن اُنھوں نے انکار کیا تو اس کی ان کو سزا یہ ملی:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ
فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۔ (المائدہ ۲۵)

"(اللہ نے) فرمایا اچھا تو یہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے۔ ان نافرمانوں پر ہرگز ترس نہ کھاؤ"

چنانچہ پوری قوم چالیس سال تک صحرائے سینا میں ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اللہ کے نبی و رسولؑ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے جو قوم کے ڈھٹائی کے اس کورے جواب اور نافرمانی کے اس طرزِ عمل سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ دعا کی :

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (المائدہ ۲۶)

"(حضرت موسیٰؑ نے) کہا اے میرے رب ! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔"

رسول اپنی مرضی سے اپنی قوم سے علیحدہ نہیں ہو سکتا اس لیے حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے التجا کر رہے ہیں کہ قوم کے اور ان کے درمیان تفریق فرما دے۔ قوم کے جہاد و قتال سے انکار پر حضرت موسیٰؑ کے رنج و غم کا یہ عالم ہے کہ وہ بیزاری کا اس بے چارگی کے ساتھ اظہار فرما رہے ہیں۔ یہ ایک طرف قوم کی بدبختی اور بدنصیبی کی علامت ہے تو دوسری طرف دین کی حمیّت و غیرت کی نشانی ہے۔ اسی حمیّت دینی کے جذبے سے غضبناک ہو کر حضرت یونس علیہ السلام بھی تو خطا کر بیٹھے تھے کہ بغیر اللہ کی اجازت کے اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے ـــــ یہاں اللہ کا جلیل القدر رسول دعا کر رہا ہے کہ :

فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝

" اے اللہ میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے اجازت دے دے کہ میں ان سے علیحدہ ہو جاؤں ۔"

لیکن نہیں حکم ہوا رہنا ساتھ ہوگا ۔ یہ صحرائے تیہ میں بھٹکیں گے اور تم ساتھ رہو گے۔ اسی صحرا نوردی میں حضرتِ موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا ـــــ یہ معاملہ انفرادی طور پر ہونا ہوتا تو ان کے ساتھ ہوتا۔ میں اور آپ انفرادی طور پر کیا کر سکیں گے !! اللہ کے جلیل القدر پیغمبر جو بیک وقت دو موجود تھے ۔ ایک اکیلا دو گیارہ ـــــ وہ جو قوم کے کورے جواب سے آزردہ اور دل گرفتہ ہو گئے ۔ اور

تاریخ کا دھارا چالیس سال کے لیے رُک گیا ـــــ اور ثابت ہو گیا کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہی نہیں جب تک کہ جماعت و تنظیم نہ ہو۔ اگر ممکن ہوتا تو یہ کام ان دو جلیل القدر انبیاء کے ہاتھوں انجام پاتا۔

اقامت دین اور صحابہؓ کی جماعت،

آگے چلیے اور سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے۔ اس عالم اسباب اور عالم علّت و معلول میں جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین بکمال و تمام قائم و نافذ ہوا ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے اُن مومنینِ صادقین کی جانفشانیوں، سرفروشیوں ایثار قربانیوں، جدو جہد اور جہاد و قتال کے نتیجے میں ہوا ہے جو اللہ پر، اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور یوم آخرت پر پختہ ایمان و ایقان رکھتے تھے۔ جو اس کسوٹی پہ کھرے اترے تھے جو سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ

" اور تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہُوئے"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے جان نثاروں کی جو جماعت و تنظیم قائم ہوئی تھی اس کی مدح اللہ تعالیٰ سورہ فتح میں ان الفاظ مبارکہ سے فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۲۹)

"محمد اللہ کے رسُول ہیں اور جو لوگ انؐ کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے، انہیں رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات اور نشانات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ ان میں سے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔"

صحابہ کرامؓ کی اس جماعت وتنظیم نے دعوتِ الی اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ، شہادت علی الناس اور اظہارِ دین کے لیے شدائد ومصائب، فقر وفاقہ، کشمکش، تصادم، سعی و محنت اور جہاد وقتال میں جاں نثاری اور صبر ومصابرت اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کی ہیں، جن کی نظیر تاریخ انسانی آج تک پیش نہیں کر سکی اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ وہ خاک وخون میں لوٹے ہیں اور انھوں نے نقدِ جاں کا نذرانہ اللہ کی راہ میں پیش کیا ہے تو اللہ کا دین غالب اور قائم ونافذ ہوا ہے۔ ایسے ہی جاں نثاروں کے لیے یہ نوید جاں فزا دی گئی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الصف)

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لمحۂ فکریہ غور کیجیے کہ بالفرض صحابہ کرامؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ الی اللہ پر لبیک نہ کہتے۔ آپؐ کے دستِ مبارک پر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے

جان نثاری اور سرفروشی کی بیعت نہ کرتے۔ استقامت اور صبر و مصابرت کا عملی مظاہرہ نہ کرتے۔ سمع وطاعت کو اپنا شعار نہ بناتے۔ ہجرت و جہاد کو اپنے لیے دُنیا اور آخرت کی سعادت اور فوز و فلاح ہونے کا یقین نہ رکھتے تو کیا اس عالم اسباب میں وہ نتائج برآمد ہوتے جو عہدِ نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں نکلے اور اس دُنیا میں وہ صالح معاشرہ وجود میں آیا جو ہر لحاظ سے نوع انسانی کے لیے جنتِ ارضی ثابت ہوا!!

جماعت کا حکم

ان دو نظیروں کے بعد کسی مزید عقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادتِ رب شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے التزام جماعت وتنظیم ناگزیر ہے۔ لابد ہے۔ واجب ہے اور فرض ہے۔ اسی بات کی تفہیم کے لیے گفتگو کے آغاز میں آپ کو میں نے تیسری حدیث وہ سنائی تھی۔ جس کے راوی ہیں حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ اور جس کو صاحبِ مشکوٰۃ المصابیح نے بحوالہ مسند احمدؒ و جامع ترمذیؒ اپنی کتاب میں درج کیا ہے:

اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ

"مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں"

یہ سنتِ رسول ہے۔ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ تقرب بالفرائض کا لازمی حصّہ ہے۔ حضورؐ امت کو ان پانچ باتوں کا حکم دے رہے ہیں: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللهِ جماعت کا اور سمع وطاعت کا اور ہجرت و جہاد کا۔ ہمارا تصور دین اتنا بدل گیا ہے کہ یہ پانچ باتیں لاکھ میں سے ایک کو بھی یاد نہیں — شہر لاہور کی آبادی تیس لاکھ کے لگ بھگ ہوگی، مجھے تیس ایسے اشخاص نکال دیجیے، جن کو یہ پانچ باتیں معلوم ہوں، یاد ہوں — میں آپ کو بتاؤں کہ یہ پانچ باتیں علماء کو بھی یاد نہیں ہیں۔ الاّ ماشاء اللہ مجھے اس حدیث کی سند درکار تھی تو میں نے ایک بہت بڑے عالم دین سے رجوع کیا اور ان کو یہ حدیث سنا کر سند معلوم کرنی چاہی۔ فرمانے لگے، الفاظ بڑے غیر مانوس سے ہیں، حالانکہ یہ روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے — مشکوٰۃ

کو علمِ حدیث کا قاعدہ سمجھیئے اور وہ ہر دار العلوم کے نصاب میں لازماً شامل ہوتی ہے۔ یہ کوئی مستدرک حاکم یا اس درجے کی احادیث کی کتابوں کی روایت نہیں ہے بلکہ مشکوٰۃ میں مسند احمد اور ترمذی کے حوالے سے روایت کی گئی ہے۔ لیکن نامانوس ہے چونکہ تصور بدلا ہوا ہے۔ جس سے بھی پوچھیں گے اُسے ارکانِ اسلام یاد ہوں گے۔ شہادتین نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ الحمدللہ یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ ارکان یاد ہیں۔ یہ درحقیقت ارکانِ اسلام ہی ہیں۔ اس کی میں نفی نہیں کر رہا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ لیکن یہ پانچ باتیں بھی سنتِ رسول ہی کا جزو ہیں اور آنحضورؐ ان کی امر کے سیکھنے میں تاکید فرمائی ہے۔

اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں ـــــ ایک دوسری حدیث میں اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، کے بعد الفاظ آئے ہیں۔ " اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے ـــــ پہلی بات بالجماعۃِ " جماعت کی زندگی اختیار کرو" ـــــ

سمع وطاعت

اور جماعت کیسی! چار آنے کی ممبری والی جماعت ؟ کوئی محض جزوی سا تعاون کی طلب گار جماعت ؟ نہیں قطعی نہیں بلکہ جو جماعتی زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اس میں دو باتیں لازمی ہیں۔ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ۔ جس میں ڈسپلن ہو، تنظیم ہو کہ "سنو اور اطاعت کرو"۔

ہجرت کا وسیع تر مفہوم

اس جماعت کا کام کیا ہو گا؟ جماعت مقصود بالذات تو نہیں ہے۔ اس جماعت کو جو کام کرنا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وَالْهِجْرَةِ اور دوسرا وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللهِ۔ ہجرت کا وسیع تر مفہوم ہے "چھوڑو" اس چیز سے جس سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور کرو ہر وہ کام جس کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا:

اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللهِ

"کون سی ہجرت افضل ہے اے اللہ کے رسول؟"

آنحضورؐ نے فرمایا:

اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ

"یہ کہ تو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو تیرے رب کو پسند نہیں"۔

یہ ہے ہجرت ــــــــــــ اور جہاد کا نقطۂ آغاز کون سا ہے!

جہاد کا وسیع تر مفہوم تو یاد کیجئے کہ میں نے اوّلین، مقدم ترین فرض کیا بیان کیا تھا؟ ــــ وہ ہے عبادتِ رب ــــ یہ ہے فرائض کا تنا جس سے فرائض کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس فرض کی بجا آوری کے لیے سب سے پہلے کشاکش اپنے نفس سے کرنی پڑتی ہے وہ جہادِ اکبر ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا گیا:

اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

"کون سا جہاد افضل ہے اے اللہ کے رسول"

آنحضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ

"وہ یہ کہ تو اپنے نفس سے کشمکش کرے اور اسے اللہ کا مطیع و فرمانبردار اور اس کو اللہ کی مرضی پر چلنے کا خوگر بنائے"

بتائیے کہ سب فرائضِ دینی ایک وحدت ہیں یا نہیں ہے؟ اس کی جڑ ہے ایمان اور اس کا تنا ہے عبادتِ رب۔ بات سمجھ میں آجائے تو بڑی مختصر۔ کسی حوالے سے سمجھ لی جائے اتباعِ سنّت کے حوالے سے سمجھنا چاہو تو بات وہی ہے۔ اسے تقرب الی اللہ کے حوالے سے پہچاننا چاہو تب بھی بات وہی ہے۔ اس کو اس حوالے سے سمجھنا چاہو کہ از روئے قرآن حکیم دینی فرائض کا تصور کیا ہے؟ تو بھی بات وہی ہے۔

ہمارا معاملہ ہم پاکستانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہی نہیں ہے دُنیا بھی ہے۔ ہم تو ناچار مسلمان شو، پر مجبور بھی ہیں۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارا دُنیا میں دین، کے قیام و نفاذ کے بغیر کوئی ٹھکانا نہیں۔ اتنی بڑی گواہی موجود کہ اسلام اور دین کے نفاذ سے اعراض و اغماض کی سزا کے طور پہ آپ کا ملک دو لخت ہوا۔ اب پھر دین سے بے اعتنائی، لاتعلقی بلکہ اس کے خلاف افعال و اعمال کی پاداش میں موجودہ ملک دو لخت بلکہ سہ لخت بھی ہو سکتا ہے۔ سازشیں ہو رہی ہیں۔

اسلام دشمن عناصر زیر زمین موجود ہیں۔ ان سے حکومت کس طرح نمٹتی ہے وہ جانے اور اللہ جانے۔! ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں ؟ اور ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں ؟؟

اپنے اولیاء کے ساتھ اللہ کا معاملہ

یہاں یہ بات پیش نظر رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے اولیاء کے ضمن میں معاملہ بڑا مختلف ہے۔ اگر یہاں صحیح معانی میں چند لوگ گفتار و کردار کے لحاظ سے اللہ کے ولی بن جائیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے اس ملک کی کشتی بھنور سے نکل سکے اور بیڑا پار لگ سکے۔ یہ ہوتا ہے اور وہ بات غلط نہیں ہے جو فارسی کے اس شعر میں کہی گئی ہے ؎

تا دلِ صاحب دلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

اللہ تعالیٰ کو اپنا ایک ولی بھی اتنا محبوب ہوتا ہے کہ بعض اوقات کسی ایک ولی کا دکھ بھی اُسے گوارا نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ اس کا اتنا کچھ تعلق ہوتا ہے کہ پوری پوری قوموں کے فیصلے اس کے حوالے سے ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے کچھ ولیوں کی وجہ سے ہماری مہلت (LEASE) کچھ اور بڑھا دے۔

مہلت ختم ہوتی ہے

جان لیجیے اس مہلت (LEASE) کی میعاد ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ میں سنسنی خیزی پیدا کرنی نہیں چاہتا۔ لیکن حالات و واقعات جو رُخ اختیار کر رہے ہیں اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ڈھیل ختم ہونے کو ہے اور ڈور کھنچنے والی ہے اور ہم تباہی کی آخری حدوں تک پہنچا چاہتے ہیں۔ اگر مزید اور تازہ مہلت (FRESH LEASE) درکار ہے تو راستہ یہی ہے کہ ایک تنظیم اور جماعت ہو جو خود بھی عبادت رب کی راہ پر گامزن ہونے کی مخلصانہ کوشش کرے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دے۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ انفرادی طور پر ایمان کی اساسات جیسے جیسے محکم ہوں گی اور سیرت کردار کی تعمیر شروع ہوگی۔ اخلاق بدلیں گے، معاملات درست ہوں گے۔ گھر کے ماحول میں

صبغۃ اللہ غالب ہوگا اور جیسے جیسے خلقِ خدا کو دعوتِ عبادتِ رب دی جائے گی ویسے ویسے یہ تبدیلی اور دعوت معاشرے پر اثر انداز ہوتی چلی جائے گی اور اس طرح انشاءاللہ اصلاحِ معاشرے کا یہ عمل اس اسلام کو اس ملک میں مستحکم بنیادوں پر قائم و نافذ کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔

قیام جماعت کی قرآنی تعلیم اور اس کی اساسات

میں نے آغاز میں قرآنِ حکیم سے سورہ آلِ عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کی تلاوت کی تھی۔ اب میں چاہوں گا کہ آج کی گفتگو ختم کرنے سے قبل ان آیات سے دعوت و اصلاح اور اس کے لیے ایک جماعت و تنظیم کی ضرورت کی جو رہنمائی ملتی ہے اس کا لائحہ عمل بھی آپ کے سامنے آجائے۔ ان آیات میں دعوتِ عبادتِ رب ایک دوسرے اسلوب سے دی گئی ہے۔

تقویٰ: ان آیات میں سب سے پہلے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔"

ہمارے دین کی اصطلاحات میں "تقویٰ" بہت جامع ترین اصطلاح ہے۔ اتنا وقت نہیں کہ میں اس کی پوری شرح کر سکوں۔ اجمالاً یہ سمجھ لیجئے کہ تقویٰ عبادتِ رب کے اس طرزِ عمل کی تشریح ہے کہ ایک بندہ مومن اللہ کی ناراضگی اور اس کی سزا کے خوف اور اس کے انعام، نگاہِ کرم اور نظرِ ترحم کے شوق سے نافرمانی و معصیت کے ہر عمل سے بچتا ہوا دین یعنی عبادتِ رب کے تقاضوں اور مطالبوں کو ادا کرنے کی فکر کرے۔

فرمانبرداری اور اطاعت: آیت کا اگلا حصہ اسی تقویٰ کی زندگی کی شرح ہے کہ:

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

"تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے فرمانبردار ہو۔"

یعنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی شعوری طور پر اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی میں نہ گزرے مبادا اسی حال میں تم کو موت آ دبوچے کہ تم معصیت کا ارتکاب کر رہے ہو۔ لہٰذا دعوتِ بندگیٔ رب کا پہلا نکتہ ہوگا اسی تقویٰ کی دعوت، تطہیرِ افکار و اعمال کی دعوت، اخلاق و معاملات کی درستگی کی دعوت اور تمام معاصی سے اجتناب کی دعوت، مسلمان کی حیثیت سے جینے اور مرنے کی دعوت۔

اعتصام بحبل اللہ

اگلی آیت کا پہلا حصہ ہے کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" اللہ کی رسی سے مراد "قرآن مجید" ہے[1] اسی کو نبی اکرم ﷺ نے ایک طویل حدیث میں هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ قرار دیا ہے۔ یہ کتابِ الٰہی وحدتِ امت کی اوّلین اور مضبوط ترین بنیاد ہے۔ یہی الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى ہے۔ اسی کا وصف لَا انْفِصَامَ لَهَا ہے۔ اسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقے سے بچنے کا آیت کے اس حصے میں حکم دیا گیا ہے۔

افتراق و تفرقہ سے بچو

امت کے اتحاد اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا عمل تفرقہ ہے۔ اختلاف اور تفرقے میں بڑا فرق ہے۔ اختلاف دین کے دائرے میں رہے کوئی مضائقہ نہیں لیکن رائے، قیاس اور تعبیر کے اختلافات کی بنیاد پر علیٰحدہ علیٰحدہ باقاعدہ فرقے بنا لینا دینی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے اور تباہ کن ہے ـــــ غور کیجیے کہ ان اختلافات کی نوعیت ہے کیا؟ کوئی رفع یدین کرنے کا قائل ہے کوئی نہیں کرتا، کوئی آمین زور سے کہتا ہے کوئی آہستہ کوئی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا قائل ہے کوئی نہیں۔ یہ جزوی اختلافات ہیں۔ ان سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان تمام مسالک کے لیے احادیث بھی موجود ہیں اور آثارِ صحابہؓ بھی۔ اب ان مسائل کی تائید یا تردید پر تمام توجہات مرکوز کرنا آخر کون سی خدمتِ دین ہے! جبکہ حال یہ ہے کہ ہماری نوّے فیصد آبادی دین سے دور جا چکی ہے اور سرے سے نماز کی

---

[1] اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی معرکۃ الآرا تالیف "قرآن مجید پر مسلمانوں کے حقوق" کا مطالعہ انشاء اللہ مفید مطلب ہوگا (مرتب)

ادائیگی ہی سے غافل ہے۔ یہ تفرقہ بازی امت کے لیے کتنی ہلاکت خیز ہو رہی ہے اس کا اندازہ ہر حساس شخص کو خود ہوگا۔ اس تفرقہ بازی کا علاج بھی خود اللہ تعالیٰ نے "اعتصام بالقرآن" قرار دیا ہے۔!

کہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا اس آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت اور احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ قرآن مجید اور ایمان واسلام نے اُن قبیلوں کو باہمی شیر وشکر اور بھائی بنا دیا جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اس طرح تباہی کی آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس تباہی سے بچالیا، فرمایا: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا قرآن حکیم کا ایک عظیم ترین اعجاز یہ بھی ہے کہ اس کے وقتی احکام اور تبصروں میں ابدالاباد تک کے لیے ہدایات موجود ہوتی ہیں۔

ہمارے لیے رہنمائی

چنانچہ غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ الفاظِ مبارکہ ہمارے ہی لیے نازل کیے گئے ہیں اور ان میں ہمارے لیے پوری رہنمائی موجود ہے۔ ہم تفرقے اور انتشار کے تباہ کن اور ہلاکت خیز گڑھے کے کنارے فی الواقع کھڑے ہیں اور تباہی و بربادی کے اس گڑھے میں گرا ہی چاہتے ہیں۔ ہم اس سے بچائے جا سکتے ہیں اور ہم پہ اللہ کی اس نعمت کا فیضان ہو سکتا ہے کہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے سے الفت، مودّت اور اخوت پیدا ہو جائے۔ لیکن اس کی شرائط ہم کو پوری کرنی ہوں گی اور وہ یہ کہ ہم واقعی بندہ رب بنیں۔ تقویٰ، اسلام اور اعتصام بالقرآن کو اپنا لائحہ عمل اور مقصود و مطلوب بنالیں اور آخرت میں اللہ کی رضا کا حصول ہمارا نصب العین بن جائے۔ ہم تفرقے سے بچیں اور متقی مسلمان کی طرح انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرنے کی اخلاص کے ساتھ پوری کوشش کریں اسی آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

"اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی نشانیاں واضح کرتا ہے شاید کہ (ان نشانیوں سے) تمھیں ہدایت کا سیدھا راستہ نظر آ جائے اور تم اس پر گامزن ہو جاؤ۔"

دعوت الی اللہ

ان دونوں آیات کے بین السطور میں یہ ہدایت موجود ہے کہ اصلاح حال کے لیے اس ملک میں وسیع پیمانے پر عبادتِ رب، تجدید ایمان، تقویٰ و اسلام، توبہ و انابت اور اصلاحِ افکار و اعمال کی ایک زوردار دعوت اُٹھے جس کے کارکن خود بھی جاگیں حقیقی طور پر بندۂ رب بننے کی سعی و کوشش کریں، اپنے غلط و غیر اسلامی ماحول سے کشمکش کریں اور لوگوں کو بھی جگائیں۔ منادبن کر کھڑے ہوں کہ اللہ کے بندو! ہوش میں آؤ، کہاں جا رہے ہو؟ تم مدہوش ہو، خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ تمھیں اپنے ذاتی اور حقیر مفادات کی فکر ہے فروعی اور جزوی مسائل میں الجھ کر تم ایک دوسرے سے دست بگریباں ہو جب کہ حال یہ ہے کہ وہ پورا جہاز ڈوبنے کو ہے جس میں ہم سب سوار ہیں۔ تم آپس میں جھگڑ رہے ہو کہ کون جہاز کی نیچی منزل میں ہے اور کون اونچی منزل میں! تم کو اس جہاز کی سلامتی کی فکر ہی نہیں ہے جو ڈوبنے والا ہے ۔! یہ ہیں ان لوگوں کے کرنے کے کام جن کو اپنے ان دینی فرائض کی ادائیگی کا احساس ہو جائے۔

لزومِ جماعت کی تاکید اور اس کیلئے سہ نکاتی لائحہ عمل

اگلی آیت میں ایسی داعی جماعت کے لزوم کی تاکید فرما کر اس جماعت کے لیے سہ نکاتی پروگرام پیش فرما دیا گیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

"اور تم میں ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہیئے جو لوگوں کو خیر اور نیکی کی طرف بلانے والی ہو، جو بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے

یہی لوگ (جو جماعتی طور پر دعوت کا یہ کام کریں گے) فلاح پائیں گے ۔"

غور کیجیے۔ اس آیت مبارکہ میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہونی ضروری ہے، جس کی تاسیس کسی فقہی مسلک کی بنیاد پہ نہ ہو، جس کی بنیادِ قیام انتخابی سیاست پر نہ ہو اور جس کو نہ اقتدار مطلوب ہو نہ سیادت و حکومت۔ بلکہ جس کا مقصدِ وجود صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ اس دنیا میں اس جماعت کو کسی بدلے اور اجر کی خواہش نہ ہو، نہ کوئی دنیوی غرض اس کے کام میں شامل ہو۔ نہ سیادت نہ قیادت نہ لیڈری نہ وزارت نہ سفارت ـــــ دُنیا کا کوئی مفاد اور کوئی غرض اس دعوتی کام سے وابستہ نہ ہو۔ اس جماعت کے وابستگان صرف یہی تین کام کریں جو اس آیت مبارکہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے سوا کسی چوتھے کام کے خیال کو وہ اپنے ذہن میں گذرنے بھی نہ دیں۔ وہ علی رؤس الاشہاد اعلان کر دیں کہ ہمارا انتخابی سیاست سے کوئی تعلق و سروکار نہیں ہوگا ـــــ جو لوگ یک سو ہو کر ہمہ تن دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سہ نکاتی پروگرام میں مصروف ہو جائیں گے۔ ان ہی کے لیے یہ بشارت اور نوید جانفزا ہے کہ: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔"

توبہ کی منادی

آج ہمارا معاشرہ اس کا شدید محتاج ہے کہ اُسے جھنجوڑا جائے اس میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے۔ اس کو پکارا جائے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا "اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو نارِ جہنم سے" اس میں توبہ کی ایک عمومی منادی کی جائے کہ اللہ کے بندو! باز آؤ معصیت اور نافرمانیوں سے، باز آؤ حرام خوریوں سے۔ باز آؤ ہیرا پھیریوں سے باز آؤ رشوت دینے اور اور رشوت خوری سے۔ باز آؤ ملاوٹ سے اور ذخیرہ اندوزی سے۔ باز آؤ سودی کاروبار سے کم تولنے اور کم ناپنے سے۔ اپنی تمام بداعمالیوں اور بے عملیوں سے توبہ کر کے اپنے ایمان کی

تجدید کرو ـــــ اپنے رب کے ساتھ از سرِ نو عہد کرو کہ اے اللہ! ہم تیرے مخلص بندے بن کر خود بھی انفرادی طور پر دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی حدِ استعداد اور استطاعت کوشش کریں گے اور تیرے دین کے داعی بن کر معاشرے کو بھی عبادت رب اور توبہ و انابت الیٰ اللہ کی دعوت دیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔

"اے ایمان والو! اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ۔ بعید نہیں کہ اس توبہ کی بدولت اللہ تم سے تمھاری بُرائیاں دور فرما دے۔"

توبہ کا یہ عمل اگر عوام و خواص میں ایک ہمہ گیر اور اجتماعی سطح پر نہیں ہوتا تو جان لیجیے کہ اس دُنیا میں بھی عذابِ الٰہی سے سابقہ پیش آ کر رہے گا اور آخرت میں بھی ـــ اجتماعی توبہ سے عذابِ خداوندی ٹل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ قومِ یونسؑ پر عذاب الٰہی کے آثار شروع ہو گئے تھے لیکن وہ ان کی اجتماعی توبہ سے ٹل گیا تھا۔ پس اجتماعی توبہ کی یہ برکت ہے ـــ آپ کو یاد ہو گا کہ چند سال قبل ملک گیر پیمانے پر یہاں ایک "یوم میثاق" منایا گیا تھا۔ لیکن حاصل کیا ہوا؟ دن منانے آسان ہیں جبکہ فی الواقع قلوب و اذہان کو عبادتِ ربّ کا خوگر بنانے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک جماعت، ایک تنظیم درکار ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

آج داخلی اور خارجی طور پر ہم جن حالات سے دوچار ہیں یہ دراصل تنبیہ خداوندی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے غافل ہیں۔ اگر یہ تغافل اسی طرح جاری جا رہا تو عذابِ الٰہی سے محفوظ رہنا ممکن نہیں۔ اس وقت ہم اجتماعی توبہ، مخلصانہ توبہ کے محتاج ہیں، یہی عمل ہم کو اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

؎ چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

فساد اور بگاڑ کے ماحول میں معاشرے کے تین طبقات :

اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیئے کہ جب کسی امت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس بگڑے ہوئے معاشرے میں تین طرح کے طبقات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو بگاڑ میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بگاڑ سے خود تو بچے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کو روکتے نہیں، ان کو نصیحت کرنے میں تغافل شعاری اختیار کرتے ہیں ـــــ تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو خود بھی بگاڑ سے مجتنب رہتا ہے اور لوگوں کو روکنے کے لیے مواعظ و نصائح کرتا ہے اور اصلاح احوال کی سعی و کوشش میں لگا رہتا ہے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ یہ تیسرا طبقہ عذابِ الٰہی سے بچا لیا جاتا ہے اور اگر دُنیا میں وہ کہیں اس کی پیسٹ میں بھی آجائے تو آخرت میں وہ فوز و فلاح سے سرفراز کیا جاتا ہے اور آخرت میں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

انتخابی سیاست سے اجتناب کی حکمت

میں نے عرض کیا تھا کہ وہ جماعت یا تنظیم جو دعوت الی الخیر کے لیے وجود میں آئے اُسے انتخابی سیاست سے بالکلیہ علیحدہ رہنا چاہیئے۔ اس کی حکمت بھی سمجھ لیجیے۔ انتخابی سیاست کا میدان حصول اقتدار اور سیادت و قیادت کی جنگ کا میدان ہے۔ یہ تحزب، تعصب اور حریفانہ طرزِ عمل کی راہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا راستہ ہے۔ اس راہ میں دلوں میں کدورتیں اور تلخیاں بڑھتی ہیں۔ مخالفتیں اور دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس راہ میں 'ووٹروں' کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اس لیے ان کے غلط اور غیر اسلامی افکار و اعمال اور معاملات پر مداہنت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس میدان میں ہر پارٹی دوسری پارٹیوں اور اُن کے قائدین کو طعن و تشنیع اور استہزاء و تمسخر کا ہدف بناتی ہے جس کے باعث آپس میں نفرتیں بڑھتی ہیں۔ جبکہ دعوتِ الی الخیر، اصلاح، خیر خواہی اور نصح کی راہ ہے۔ دلوں کو جیتنے اور باہمی الفت و مودت، اور اخوت پیدا کرنے کی راہ ہے۔

یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ میرے نزدیک سیاست کوئی شجرِ ممنوعہ ہے یا ہمارے دین کے دائرے سے باہر کی کوئی چیز ہے میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارے دین میں سیاست بھی ہے، حکومت کے معاملات بھی ہیں اور یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ میرا ایمان ہے کہ ہمارا دین انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے بحث کرتا ہے[1] چاہے وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں چاہے اجتماعی زندگی سے۔ پھر صرف بحث ہی نہیں کرتا بلکہ ان تمام گوشوں کو اپنے تحت لانے کا مطالبہ کرتا ہے :

یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً

"اے اہل ایمان اسلام (نظامِ فرمانبرداری) میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔"

علامہ اقبال نے اسی کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ

ع جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مزید براں "سیاست" کا لفظ بڑے مقدس انداز میں حدیث شریف میں آیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِیَاءُ

"بنی اسرائیل کا معاملہ یہ تھا کہ اُن کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں رہتی تھی۔"

دعوت الی الخیر میں سیاسی نظام کی تبدیلی شامل ہے۔ یہ اظہار دین علی الدین کلہ کی اعلیٰ و ارفع منزل ہے۔ دنیا میں عبادت ربّ کا یہ مظہر اتم و اکمل ہے۔ لیکن انتخابی سیاست جس کی بنیاد حریفانہ انداز سے حصولِ اقتدار ہوتی ہے۔ ہمیں اس طور کی سیاست میں کسی حال میں شریک نہیں ہونا ہماری منزل اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبہ دین حق ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خواب اُمتِ مسلمہ میں تجدید ایمان۔ توبہ اور تجدید عہد کی عمومی تحریک کے

---

[1] اس بات کی تفہیم کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب کے دس خطاباتِ جمعہ کا مجموعہ "منہج انقلابِ نبوی" اور "نبی اکرم سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں" ملاحظہ فرمائیں (مرتب)

بغیر سر چشمۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کا پہلا اور مقدم مرحلہ تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت و کردار ہے جس کی اصل اساس ایمان ہے اور اس ایمان و یقین کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں جب میں شعوری طور پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایک تنظیم ایک جماعت ناگزیر، لازم، واجب بلکہ فرض ہے تو یہ بھی عزم کر لیا تھا کہ اس مقصد کے لیے جماعت بنانے کی کوشش کروں گا لہٰذا میں نے دعوت رجوع الی القرآن کا تنہا کام شروع کیا۔ میں اس وقت بھی تنہا ہی اپنے آپ کو جماعت سمجھتا تھا۔ —— اللہ کے فضل سے ۱۹۷۲ء میں وہ پہلا مرحلہ آ گیا کہ دعوت رجوع الی القرآن کے لیے انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ اسی موقع پر میں نے "میثاق" میں صاف لکھ دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ یہ جماعت نہیں ہے جو میری اصل منزل ہے۔ یہ عبوری دَور اور ابتدائی مرحلے کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میری دعوت پر تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔

نظامِ بیعت | اِس تنظیم کی تشکیل میں ہم نے دستوری قانونی اور جمہوری اصولوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا جو ہمارے نزدیک مغرب سے درآمد ہوئے ہیں بلکہ ان کو بالکل چھوڑ کر ہم نے اس ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے نظامِ بیعت کے اصول اور طریقے کو اختیار کیا۔ جو قرآن مجید کی اصطلاح ہے اور جو سنتِ رسول کی اصطلاح ہے۔ جو ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے جو ہماری ماضی کی تمام دینی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اعمال کے لیے جو بیعت ہوتی رہی ہے۔ جو 'بیعت ارشاد' کہلاتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جو بھی تحریکیں اُٹھی ہیں وہ بھی بیعت کے نظام پر اُٹھی ہیں، جن کی اعلیٰ و ارفع منزل قتال فی سبیل اللہ رہی ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس برصغیر میں اصل طریق محمدی اور سلوک محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا جب سید احمد بریلوی نے نے احیاء کیا تھا تو وہ بیعت ہی کی بنیاد پر کیا تھا۔ ہم کسی جزو میں بھی مغرب کی

تقلید نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اُسی طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں اور اُسی کو افضل اور باعثِ خیر سمجھتے ہیں جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہو اور جس پر ہمارے سلف صالحین گامزن رہے ہوں۔ اسی لیے ہم نے طریقِ تنظیم باہر سے دَرآمد شدہ جمہوری و دستوری طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ طریقہ بیعت اختیار کیا ہے اور اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی قرآنی ہدایت کو اپنا رہنما اصول بنایا ہے ــــ بیعت کا طریقہ لوگوں کو بُرا لگے، بھلا لگے۔ لوگ اس کا مضحکہ اڑائیں، تمسخر کریں، ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بیعت کا لفظ اگر فی زمانہ بدنام ہے تو غور کیجیے کہ ہمارے کرتوتوں کی وجہ سے "اسلام" کا لفظ کون سا نیک نام رہ گیا ہے۔ ذرا دنیا میں جاکر دیکھئے کہ لوگوں کے اسلام کے بارے میں تاثرات کیا ہیں! واقعہ یہ ہے کہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے غیر مسلم دنیا میں اسلام کو ذلت وخواری کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ تو کیا محض اس سبب سے ہم اسلام کو تج دیں گے؟ ظاہر ہے کہ کوئی فاسق اور فاجر مسلمان بھی، جس کے دل میں ایمان کی ایک رمق بھی باقی ہو بقائمِ ہوش وحواس یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ پس بیعت کا لفظ چاہے کتنا ہی بدنام کیوں نہ ہو، لیکن یہ ہمارے دین کی اصطلاح ہے، لہٰذا اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ یہ طریق بھی عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ کی تکمیل ہے۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم سنت سے ماخوذ طریقِ تنظیم کو اختیار کریں۔ اسی میں فوز وفلاح ہے۔

حرفِ آخر حضرات! بس میں ان گزارشات پر اکتفا کرتا ہوں۔ خاتمہ کلام سے قبل میں چاہتا ہوں کہ وہ سوالات آپ کو پڑھ کر سنادوں، جن پر مجھے آج کی اس تقریر میں گفتگو کرنی تھی۔ وہ سوالات یہ ہیں:

ازروئے قرآنِ حکیم
ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں؟
اور آیا اُن کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن ہے؟

سنتِ رسول کا مقام کیا ہے؟
اور موجودہ دَور میں اتباعِ رسول اور احیائے سنت کے تقاضے کیا ہیں؟
طریقت اور سلوک کی حقیقت کیا ہے؟
اور تقرب الی اللہ کے ذرائع و وسائل کون سے ہیں؟

مزید براں یہ کہ ـــــ
ملک و ملّت کے بقاء و استحکام کے ضمن میں ہم اپنی ذمّہ داریاں کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جو جوابات میں دے سکتا تھا میں نے اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک ان کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ سوچیں، غور کریں، مطالعہ کریں، کوئی اشکال ہو، کوئی الجھن ہو تو مجھ سے دریافت کریں، میرے ساتھیوں سے پوچھیں، کوئی وضاحت مطلوب ہو تو ہم حاضر ہیں۔ کوئی بات غلط معلوم ہوئی ہو تو اس کی غلطی ہم پر واضح کریں۔ ان سب کے لیے ہمارا سینہ کشادہ ہے۔ لیکن اگر معاملہ یہ ہو کہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق یہی ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے۔ سلوک و طریقت کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے۔ تقرب بالفرائض کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے۔ از روئے عقل و منطق بھی صحیح بات یہی ہے، تو پھر اس سے دور رہنا، اس سے کنارہ کش رہنا، اس سے دامن بچا بچا کر نکلنا میرے نزدیک بہت بڑا جُرم ہے۔ میں آپ کی نصح اور خیر خواہی کے پیشِ نظر آپ کو خبردار (WARN) کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد آپ کی ذمّہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر بات یہ ہو کہ آپ کے خیال میں مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ میری یہ سوچ اور فکر ہی سرے سے غلط ہے۔ یا معاملہ یہ ہو کہ آپ کا دل گواہی دے کہ بات حق ہے لیکن کہنے والا ٹھیک نہیں ہے۔ آدمی غلط ہے۔ دونوں

امکانات ہو سکتے ہیں۔ اگر خلوص کے ساتھ آپ کی یہ رائے ہے تو آپ شاید اللہ کے ہاں بری ہو جائیں۔ لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو برأت کی کوئی شکل نہیں ــــ اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح رُخ پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جس فیصلے تک آپ پہنچیں اس پر عزم بالجزم کے ساتھ پیش رفت کے لیے آپ کی نصرت فرمائے۔ آپ نے اس گرمی اور حبس کے موسم میں اتنی دیر تک میری باتیں سننے میں جو محنت کی ہے اور اپنے اُوپر جو مشقت جھیلی ہے، اللہ تعالیٰ اسے آپ کے حق میں بھی مبارک کرے اور میرے حق میں بھی بابرکت بنائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ط

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف
جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جاسکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

- حیات و سیرتِ اقبال
- فلسفۂ اقبال
- ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

- اقبال اور قرآن' از قلم : سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501' فیکس: 5834000

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور کی خصوصی پیشکش

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب —— حصہ ششم

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآن حکیم کی جامع ترین سورت

یعنی

اُمُّ المُسَبِّحات

سورۃ الحدید

کی مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمد

❁ دیدہ زیب پرنٹنگ ❁ خوبصورت ٹائٹل ❁ صفحات: 368
❁ اشاعت عام: 100 روپے ❁ اشاعت خاص: 200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاھور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 03-5869501

تنظیمِ اسلامی کا پیغام　　نظام خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق یعنی

اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت

قائم کرنا چاہتی ہے

امیر : حافظ عاکف سعید